PAKSOCIETY.COM
تعلیم و تربیت
عید میلاد النبی ﷺ مبارک
سالِ نو مبارک
جنوری 2015
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
اجنبی
WWW.PAKSOCIETY.COM

2015

January

S	M	T	W	T	F	S
				1	2	3
4	5	6	7	8	9	10
11	12	13	14	15	16	17
18	19	20	21	22	23	24
25	26	27	28	29	30	31

February

S	M	T	W	T	F	S
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28

March

S	M	T	W	T	F	S
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28
29	30	31				

April

S	M	T	W	T	F	S
			1	2	3	4
5	6	7	8	9	10	11
12	13	14	15	16	17	18
19	20	21	22	23	24	25
26	27	28	29	30		

May

S	M	T	W	T	F	S
					1	2
3	4	5	6	7	8	9
10	11	12	13	14	15	16
17	18	19	20	21	22	23
24	25	26	27	28	29	30
31						

June

S	M	T	W	T	F	S
	1	2	3	4	5	6
7	8	9	10	11	12	13
14	15	16	17	18	19	20
21	22	23	24	25	26	27
28	29	30				

July

S	M	T	W	T	F	S
			1	2	3	4
5	6	7	8	9	10	11
12	13	14	15	16	17	18
19	20	21	22	23	24	25
26	27	28	29	30	31	

August

S	M	T	W	T	F	S
						1
2	3	4	5	6	7	8
9	10	11	12	13	14	15
16	17	18	19	20	21	22
23	24	25	26	27	28	29
30	31					

September

S	M	T	W	T	F	S
		1	2	3	4	5
6	7	8	9	10	11	12
13	14	15	16	17	18	19
20	21	22	23	24	25	26
27	28	29	30			

October

S	M	T	W	T	F	S
				1	2	3
4	5	6	7	8	9	10
11	12	13	14	15	16	17
18	19	20	21	22	23	24
25	26	27	28	29	30	31

November

S	M	T	W	T	F	S
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28
29	30					

December

S	M	T	W	T	F	S
		1	2	3	4	5
6	7	8	9	10	11	12
13	14	15	16	17	18	19
20	21	22	23	24	25	26
27	28	29	30	31		

جنوری 2015ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

پیارے بچو! آپ سب کو عید میلاد النبیؐ مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو سارے جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔ آپ ﷺ کی سیرت پاک کا مطالعہ کریں تو آپ کو بخوبی علم ہو گا کہ عورتوں، مردوں، بوڑھوں، جوانوں اور بچوں کے علاوہ آپ ﷺ خادموں، پرندوں اور تمام مخلوق کے لیے بھی سراپا رحمت ہیں۔

آنحضور ﷺ کو بچوں سے بے حد پیار تھا۔ آپ ﷺ بچوں کے پاس سے گزرتے تو خود انہیں السلام علیکم کہتے۔ وہ بھی جواب میں وعلیکم السلام کہتے اور پیار سے آپ ﷺ کے دامن سے لپٹ جاتے۔ کبھی یوں ہوتا کہ آنحضور ﷺ بچوں کو قطار میں کھڑا کر دیتے اور خود ذرا ہٹ کر انہیں کہتے کہ دوڑ کر ہمارے پاس آؤ! بچے بھاگتے ہوئے آتے اور آپ ﷺ سے لپٹ جاتے۔ آپ ﷺ بچوں کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ انہیں دین کی باتیں بتاتے، انہیں اذان دینا اور نماز پڑھنا سکھاتے تھے۔ کسی بچے سے غلطی ہو جاتی تو آپ ﷺ نہ اسے ڈانٹتے اور نہ ناراض ہوتے بلکہ نہایت پیار سے سمجھاتے۔

پیارے بچو! دیکھا آپ نے ہمارے پیارے نبی ﷺ بچوں سے کس قدر پیار کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے سیرت و کردار، عظمت اور حق و صداقت کے بل بوتے پر اپنی نرم روی اور رحمت و محبت سے ایک ظالم اور جاہل معاشرے میں باہمی اخوت کا بیج بویا۔

ہمارے پیارے نبی ﷺ کا فرمان ہے: دُعَاءُ أَطْفَالِ أُمَّتِي مُسْتَجَابٌ (میری اُمت کے بچوں کی دعا قبول کی جاتی ہے۔)

ننھے ساتھیو! آپ پر آنحضور ﷺ کی مہربانی اور شفقت اور اللہ کا کتنا بڑا کرم ہے کہ آپ کی دعاؤں کو یہ مقام ملا۔ آپ کو چاہیے کہ سیرت پاک پر عمل پیرا ہوں، پیارے نبی ﷺ کی خدمت میں درود و سلام کثرت سے بھیجا کریں۔ یہ نبی ﷺ سے محبت و عقیدت کا بہترین اظہار ہے۔

نیا عیسوی سال 2015ء کا آغاز ہو چکا ہے۔ نئے سال کا آغاز مضبوط قوتِ ارادی، مستقل مزاجی اور لگن سے کیجیے۔ وقت ضائع مت کیجیے اور سال بھر کی منصوبہ بندی بھرپور انداز سے کیجیے کیوں کہ گیا وقت دوبارہ نہیں آتا، صرف پچھتاوا رہ جاتا ہے۔ لہٰذا آپ سے اُمید کی جاتی ہے کہ نئے سال میں اپنی پڑھائی پر خصوصی توجہ دیں گے۔ جو کام پچھلے سال ادھورے رہ گئے تھے، انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔ ہماری دعا ہے کہ نیا سال ہمارے پیارے وطن پاکستان اور ساری دُنیا کے لیے امن اور خوش حالی کا سال ہو۔

16 دسمبر منگل کے روز پشاور کے آرمی پبلک اسکول میں طلباء اور اساتذہ سمیت 142 افراد کو سفاکی سے شہید اور 250 سے زائد افراد کو زخمی کیا گیا۔ 16 دسمبر (سقوطِ ڈھاکہ) ہماری تاریخ کا سیاہ ترین دن ہے۔ اس دن ہمارے بدن کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ آج پھر اسی تاریخ کو اسی بھیانک کھیل کو دوبارہ کھیلا گیا۔ بچے جو ہمارا مستقبل تھے، ان بچوں کی زندگی سے بھرپور آنکھیں بند کر دی گئیں۔ آپ سے استدعا ہے کہ شہید ہونے والوں کے لیے دعائے مغفرت کریں اور اللہ تعالیٰ لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین! اس سانحہ میں ہمیں باہمی اختلافات بھلا کر یک جا ہو جانا چاہیے کیوں کہ قومی یا انفرادی سطح پر یہ اختلافات ہمارے دشمنوں کو موقع دیتے ہیں کہ وہ دہشت گردی پھیلا کر ہمارے وطن کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیں۔ اپنی تجاویز اور آراء سے آگاہ کرتے رہیے گا۔ اپنا بہت سا خیال رکھیے گا۔

فی امان اللہ! (ایڈیٹر)

ایڈیٹر، پبلشر
ظہیر سلام

اسسٹنٹ ایڈیٹر
عابدہ اصغر

سرکولیشن اسسٹنٹ
محمد بشیر راہی

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: عید میلاد النبی ﷺ
نیا سال مبارک

خط و کتابت کا پتا

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)=850 روپے۔
مشرقِ وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے)=2400 روپے۔
ایشیاء، افریقہ، یورپ (ہوائی ڈاک سے)=2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے)=2800 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 30 روپے

تمنا

اے خدا ہو تیری رحمت کہ تیرا ہم دم بھریں
ورطۂ تسلیم میں آئیں کوئی نہ غم کریں

ہو رقابت نہ کسی سے ہم پہ یہ آسان ہو
تیرے رستے میں مگر یہ جان بھی قربان ہو

کر رہا ہو کوئی بھی نہ کسی پہ کچھ ستم
اس جہان رنگ و بو کا ہو نہ کوئی اتنا سا غم

نامۂ اعمال اپنا گرچہ ہے بہت خفیف
روز محشر تیری رحمت ہو ہم سب کی رفیق

تیری رحمت سے ہی ہر مشکل ہوتی ہے آساں
تیری رحمت سے شفاعت ملی آخر زماں

نخل اُمیدوں کا بھر جائے گا شاہا
دامن رہے گا تیری رحمت سے ہمیشہ ہی بھرا

عقل کا وہ نور دے جس سے ہو تیری پہچاں
عشق تیرے رسول کا ہو جائے اپنا ساماں

پا گئی تجھ کو خدایا پانے والوں کی نظر
دیتے رہے تیری گواہی بحر و بر، ہجر و شجر

نسیم اختر نسیم

مدینے میں

کھلتے ہیں عقیدت کے گلزار مدینے میں
بٹتے ہیں محبت کے اثمار[1] مدینے میں

عشاق کے سینوں کو گرماتے ہیں ہر لحظہ
محبوب دو عالمؐ کے تذکار مدینے میں

ہر رات نظر آئے اک روشن دن جیسی
رحمت کے برستے ہیں انوار مدینے میں

ساون کے مہینے میں اُمڈے ہوئے بادل بھی
گاتے ہوئے آتے ہیں ملہار[2] مدینے میں

رکھتے ہیں بڑی نسبت اس نگری سے دل والے
بستے ہیں مرے آقا سرکارؐ مدینے میں

عشاق کا کیا کہنا بے تاب ہیں پانے کو
کونین کے سرور کا دیدار مدینے میں

سرکارؐ کے در سے ہی ملتی ہے شفا ان کو
آتا ہے کوئی دکھیا بیمار مدینے میں

دُنیا کے رئیسوں سے ہے بالا ہی مقام ان کا
آتے ہیں نظر جتنے نادار مدینے میں

اک بار جو آ جائے پھر خالی نہیں جاتا
کھلتے ہیں تواضع کے اسرار[3] مدینے میں

مانگے ہے اگر کوئی اک بار ہی آقاؐ سے
ملتا ہے اسے سب کچھ سو بار مدینے میں

جنت کے طلب گارو نہ دُور کہیں جانا
جنت کے نمایاں ہیں آثار مدینے میں

بیٹھا تھا ضیاءؔ لکھنے جو نعتِ نبیؐ اک دن
چشمے کی طرح پھوٹے اشعار مدینے میں

1 ثمر کی جمع یعنی پھل 2 ایک گیت جو بارش کے دوران گایا جاتا ہے 3 سر کی جمع یعنی بھید یا راز

ضیاء فراشوی

پیارے بچو! اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کو ''رحمت للعالمین'' بنا کر بھیجا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''اور (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں سارے جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔'' (الانبیاء، آیت:107)

نبی پاک ﷺ کی شفقت، رحمت اور مہربانی ہر چھوٹے بڑے، مرد وعورت، اپنے اور غیروں کے لیے یکساں تھی۔ خصوصاً آپ ﷺ بچوں سے بے حد محبت اور پیار فرماتے تھے۔ ہر طرح سے ان کی راحت اور دل جوئی کا سامان فرماتے۔ ان کی تعلیم وتربیت کا خاص اہتمام فرماتے تھے۔ ان کو اچھی اور نیک باتوں اور کاموں کی تلقین فرماتے اور بُری باتوں اور بُرے کاموں سے منع فرماتے تھے اور ایک پیغمبر کی شان بھی یہ ہوتی ہے کہ ''وہ عمدہ باتوں کا حکم دیتا ہے اور بُری باتوں سے روکتا ہے۔''

نبی پاک ﷺ کی بچوں سے محبت کے چند واقعات:

1- جب آپ ﷺ کے پاس چھوٹے بچوں کو لایا جاتا تو آپ ﷺ انہیں اپنی گود میں بٹھا لیتے۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ سے منقول ہے: ''اللہ کے نبی ﷺ مجھے ایک ران پر بٹھا لیتے اور (اپنے نواسے) حسن بن علیؓ کو دوسری ران پر بٹھا لیتے، پھر ہم دونوں کو گلے لگا لیتے اور یوں دعا دیتے: ''اے اللہ! میں ان پر شفقت کرتا ہوں تو بھی ان پر مہربانی فرما۔'' (صحیح بخاری، کتاب الادب:5544)

2- امامہ بنت ابی العاصؓ، حضرت زینبؓ کی صاحبزادی اور نبی پاک ﷺ کی نواسی تھیں۔ آپؓ سے نبی پاک ﷺ بہت محبت فرماتے تھے۔ جب نبی پاک ﷺ لوگوں کو نماز کی امامت کرواتے تو امامہ کو اُٹھا لیا کرتے تھے اور جب سجدے میں جاتے تو اسے بٹھا دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو پھر اسے اُٹھا لیتے۔
(صحیح بخاری، کتاب الصلاۃ:486، صحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلاۃ:844)

3- جناب رسول اللہ ﷺ کو اپنی لاڈلی بیٹی فاطمہؓ کے صاحب زادگان حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سے بھی بے حد محبت تھی۔ کبھی ان کو اپنے اوپر سوار فرما لیتے۔ ایک مرتبہ اسی طرح ان دونوں کو اپنے کندھوں پر سوار کیا ہوا تھا تو فرمایا: ''یہ دونوں کیا ہی خوب صورت سوار ہیں اور ان کا والد ان دونوں سے بھی بہتر ہے۔''
(طبرانی کبیر، باب الخاء:2677)

4- ایک مرتبہ نبی پاک ﷺ خطبہ دے رہے تھے کہ حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ آ گئے، دونوں نے سرخ رنگ کی قمیصیں پہن رکھی تھیں، جب وہ دونوں چلتے تو گر پڑتے۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ منبر سے اُترے اور ان دونوں (شہزادوں) کو اُٹھا کر اپنے سامنے بٹھا لیا۔ (الحدیث) (ترمذی، کتاب المناقب:3707)

5- حضرت سائب بن یزید کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، میرے ساتھ کچھ اور لڑکے بھی تھے۔ ہم آپ ﷺ کے پاس گئے تو آپ ﷺ کھجوریں نوش فرما رہے تھے اور آپ ﷺ کے ساتھ کچھ صحابہ کرامؓ بھی تھے۔ آپ ﷺ نے ان کھجوروں میں سے ایک ایک مٹھی ہمیں عطا فرمائی اور ہمارے سروں پر ہاتھ پھیرا۔ (طبرانی کبیر، باب السین 6695)

6- نبی پاک ﷺ نے حضرت انس بن مالکؓ کو تلقین فرمائی کہ کسی کو بھی دھوکہ نہ دو اور فرمایا: ''اے میرے بیٹے! یہ میری سنت ہے۔ جو شخص میری سنت کو اپناتا ہے وہ مجھ سے اظہار محبت کرتا ہے اور جو مجھ سے محبت کرتا ہے وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔'' (ترمذی، کتاب العلم:2602)

پیارے بچو!

ہمارے نبی ﷺ جس طرح پیارے تھے۔ آپ ﷺ کے طریقے اور ادائیں بھی اس طرح پیاری تھیں۔ ہمیں آپ ﷺ کے پیارے طریقوں پر زندگی گزارنی چاہیے تاکہ آپ ﷺ کے اس فرمان کے مطابق ہمیں جنت میں آپ ﷺ کی ہم نشینی مل سکے۔

یہ چھٹی صدی عیسوی تھی۔ انسانیت اپنے آپ کو ہلاک کرنے پر جنونی حد تک تُلی ہوئی تھی۔ انسانی اخلاق بگڑ چکے تھے۔ شراب اور جوا مرغوب چیزیں بن چکی تھیں۔ ان کے دل اتنے سخت ہو گئے تھے کہ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ قافلوں کو لوٹنا اور قتل کرنا ان کا محبوب مشغلہ بن چکا تھا۔ عورت کی حیثیت ایک مال مویشی جتنی تھی۔ اس دور کا نقشہ مؤرخین نے ایسا کھینچا ہے جس کے تاریخ کے وہ اوراق نہ تحریر کے، نہ بیان کے قابل ہیں اور نہ ان پر یقین کرنے کو دل آمادہ ہوتا ہے۔ انسانیت میں بُرائی اور نیکی کی تمیز کرنا مشکل تھا۔ انسانیت اپنے خالق و مالک کو بھول چکی تھی۔ اپنی جزا، سزا اور آخرت سے بے فکر تھی۔ انسانیت خودکشی کی ڈھلوان کے راستے پر گامزن تھی۔ انسانیت کی فلاح، دین و آخرت کی فکر کسی کو نہ تھی۔ کوئی ایسا نہ تھا جو خدائے واحد کی عبادت کرتا ہو۔ اس وقت کی انسانیت میں ادیب، شاعر، فلسفی اور دانش ور فطری طور پر ان شعبوں کی صلاحیت رکھنے کے باوجود انسانیت کی فلاح کا بیڑہ اُٹھانے کے قابل نہ تھے۔

معاشرے کو ایسے فرد کی ضرورت تھی جو جبلی اور فطری طور پر ان تمام خامیوں اور بُرائیوں سے پاک ہو اور اسی معاشرے میں رہ کر انہیں انسانی صفات سے بھرپور زندگی کی طرف رفتہ رفتہ لے کر آئے۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے جس انسان کو چنا، وہ انسانی طبقے کا سب سے بہتر، برتر، افضل، اکمل اور اشرف انسان تھا جس کا نام نامی اسم گرامی محمدؐ بن عبداللہ ہے۔ آپؐ رحمت للعالمین اور انسانیت کے سب سے بڑے خیر خواہ تھے۔ آپؐ کی حیاتِ مبارکہ نے انسانی زندگی کی تاریخ بدل کر رکھ دی۔ یہاں تک کہ غیر مسلم سیرت نگاروں اور مصنفین نے آپؐ کی شخصیت کا برملا اعتراف کیا ہے:

ای ڈرمنگھم (E. Dermenghem):

”عرب بنیادی طور پر انارکسٹ (بے راہ رو، لاقانونیت پسند) اور انتشار پسند تھے۔ پیغمبرؐ نے یہ زبردست معجزہ کر دکھایا کہ انہیں باہم متفق کر دیا۔ جو کچھ محمدؐ نے کر دکھایا، اسے سامنے رکھیں تو ہم ان کی عظیم ترین شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کرنے پر مجبور ہیں۔ محمدؐ اس اعتبار سے دُنیا کے وہ واحد پیغمبر ہیں جن کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ ان کی زندگی کا کوئی گوشہ چھپا ہوا نہیں ہے بلکہ روشن اور منور ہے۔ عقلِ سلیم سے عاری انسان ہی محمدؐ پر کسی بھی ذہنی بیماری کا الزام عائد کرتے ہیں۔“

(Life of Muhammad P:930)

جارج برنارڈ شا (George Bernard Shaw):

”محمدؐ ایک عظیم ہستی اور صحیح معنوں میں انسانیت کے نجات دہندہ تھے۔ میری خواہش ہے کہ اس صدی کے آخر تک برطانوی ایمپائر کو محمدؐ کی تعلیمات مجموعی طور پر اپنا لینی چاہئیں۔ انسانی زندگی کے حوالے سے محمدؐ کے افکار و نظریات سے احتراز ممکن نہیں ہیں۔ محمدؐ کے مذہب کے بارے میں مَیں پیش گوئی کرتا ہوں کہ یہ کل کے یورپ کے لیے اتنا ہی قابلِ قبول ہے جتنا آج یورپ کے لیے جو اسے قبول کرنے کا آغاز کر چکا ہے۔“

(Islam Our Choice.P:81)

سرہملٹن گب (H.A.R.Gibb):

”محمدؐ شرمیلے اور حیادار تھے اور لطیف حسِ مزاح رکھتے تھے۔ نیز انسانیت اور ہمدردی کا ایک پھیلا ہوا سمندر تھے۔“

(Muhammadanism)

ایل۔ وی واگلیری:

''محمدؐ دُنیا کے لیے ایک ایسا دین لے کر آئے جو انسان کے ذہن کو ترقی دیتا ہے۔ اس کی جمالیات کی حس بے دار، تیز تر اور مکمل ہے۔ اپنی ارتقاء کی تکمیل کرتا ہے۔ اسلام سے زیادہ روشن خیال مذہب کوئی اور نہیں۔''

(Islam Our Choice)

آئرنیا میڈفکس

''محمدؐ نے اسلام میں عورت کو وہ درجہ دیا جو آج کے جدید مغربی معاشرے میں بھی اسے حاصل نہیں۔''

(Women in Islam)

ڈی۔ ایس مارگولیوتھ (D.S. Margolioth)

''محمدؐ کی رحمت اور انسانیت بے کنار تھی، انسان تو اشرف المخلوقات ٹھہرا، نچلی مخلوقات بھی محمدؐ کی ہمدردی، انسانیت اور توجہ کا مرکز بنی۔''

(The Rise of Islam)

جان بیگٹ (جنرل گلپ پاشا) (John Bagot):

''کیا دُنیا میں کوئی اور بھی ایسی مثال مل سکتی ہے جس میں مقصد کے حصول کے لیے اُٹھنے والے کی اتنی زیادہ مخالفت کی گئی ہو؟ اس کے باوجود صبر کا دامن آپؐ کے ہاتھ سے نہ چھٹا۔ یہ بات حضورؐ کے مخالفین خصوصاً مغربی مصنفین کے لیے ایک تازیانہ ہے جو یہ کہتے ہیں کہ محمدؐ ایک غیر محتاط قسمت آزما تھے۔''

(The Life and Times of Muhammad)

ہارٹ میخائل (Hart M):

''یہ حقیقت ہے کہ پوری انسانی تاریخ میں صرف وہی ایک انسان تھے جو دینی و دُنیاوی اعتبار سے ایک غیر معمولی طور پر کام یاب و کامران اور سرفراز ٹھہرے۔''

کاونٹ ٹالسٹائی (Tolstoi):

''محمدؐ ایک عظیم الشان مصلحین میں سے ہے جنہوں نے قوموں کے اتحاد کی بہت بڑی خدمت کی ہے لیکن ان کے فخر کے لیے یہ بالکل کافی ہے، انھوں نے وحشی انسانوں کو نورِ حق کی جانب ہدایت کی اور ان کو ایک صلح پسند اور پرہیز گاری کی زندگی بسر کرنے والا بنا دیا اور ان کے لیے ترقی و تہذیب کے راستے کھول دیے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اتنا بڑا کام صرف ایک فردِ واحد کی ذات سے ظہور پذیر ہوا۔''

ایف ایم والٹیئر (FM. Voltair):

''اس سے بڑا انسان، انسانیت نواز، دُنیا کبھی پیدا نہ کر سکے گی۔''

(Phylosophical Dictionary)

آرلینڈ او:

''دُنیا اگر اپنے جھگڑوں سے نجات حاصل کر کے امن کا گہوارہ بننا چاہتی ہے پھر اسے محمدؐ کی تعلیمات پر عمل کرنا پڑے گا۔''

ای بلائیڈن:

''محمدؐ کے دین اور ان کی تعلیمات کو کن الفاظ میں سراہا جا سکتا ہے وہ حقیقی انقلاب جو ذہن بدل دے، دل بدل دے، اس کی تعریف کیسے ممکن ہے؟ محمدؐ کی روحانی فتوحات کو الفاظ کے پیرائے میں سمونا ناممکن ہے۔''

برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell):

محمدؐ ایک عظیم انسان اور فقید المثال مذہبی رہنما تھے۔ وہ ایک ایسے دین کے بانی تھے جو بردباری، مساوات اور انصاف کی بنیادوں پر کھڑا ہے۔''

آرنلڈ ٹوائن بی (A.J.Toynbee):

''محمدؐ نے اسلام کے ذریعے انسانوں میں رنگ و نسل اور طبقاتی امتیاز کا یکسر خاتمہ کر دیا، کسی مذہب نے اس سے بڑی کامیابی حاصل نہیں کی جو محمدؐ کے مذہب کو حاصل ہوئی۔ آج دُنیا جس ضرورت کے لیے رو رہی ہے، اسے صرف اور صرف مساواتِ محمدیؐ کے ذریعے اور اس نظریے کے تحت ہی پورا کیا جا سکتا ہے۔''

(Civilization on Trial)

جی۔ ڈبلیو لائٹنر (G.W. Leitner):

حقیقت یہ ہے کہ محمدؐ کی شخصیت اور ذات میں ایسی کشش اور جاذبیت ہے جو کسی دور میں کم نہیں ہو گی بلکہ کشش اور جاذبیت میں بنی نوع انسان کے لیے اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔''

(Muhammad Religious System of the World)

لین پول (Lane Pool):

''روئے زمین پر محمدؐ جیسا دُور اندیش اور صاحب بصیرت انسان کوئی دوسرا دکھائی نہیں دیتا۔''

(Studies in Mosque)

ایس۔ پی۔ اسکاٹ (Scott S. P):

''محمدؐ ایک ایسے ذہن کے مالک تھے جو مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کی گھتیاں سلجھا سکتے تھے، اس کے باوجود حیران کن حقیقت یہ ہے کہ وہ متکبر تھے نہ مغرور بلکہ عجز و رضا کے پیکر تھے۔ محمدؐ کی تعلیمات انسانوں کو صرف اور صرف نیکی کے حصول پر آمادہ کرتی ہے۔ حسد، جھوٹ، بے ایمانی اور انسان دشمنی کا قلع قمع کر دیتی ہیں۔''

☆☆☆

نئے سال کا آغاز ہو چکا تھا۔ لوگ اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے تھے۔ بازاروں میں چہل پہل شروع ہوگئی تھی۔ سات بجے ہوں گے کہ ایک محلے کے سب سے پہلے مکان کے ایک کمرے کے اندر دو بچے بڑی مستعدی دکھا رہے تھے۔

یہ دو بہن بھائی تھے۔ بہن کا نام نوشی اور بھائی کا سلیمان۔ ان کی مستعدی کی وجہ یہ تھی کہ ان کے ابو ایک روز پہلے ان کے لیے نئی جماعتوں کی کتابیں خرید کر لائے تھے اور اب وہ ان کتابوں کو بڑے شوق اور دل چسپی سے دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے انہوں نے اس الماری کے خانوں کو بھی رنگین کاغذوں سے سجا لیا تھا جس میں کتابوں کو ترتیب سے رکھنا تھا۔

اتنے میں نوکرانی نے آ کر کہا: ''ناشتے پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔''

''اچھا ابھی آتے ہیں۔'' نوشی بولی اور نوکرانی چلی گئی۔

اس وقت انہیں ناشتا بھول چکا تھا۔ کمرے سے باہر نکلنا انہیں اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''الماری میں اُوپر کے دو خانے تمہارے۔'' نوشی بولی۔

''اور نچلے میرے۔'' سلیمان بولا۔ دونوں میں خانوں کی تقسیم پر اتفاق ہوگیا۔

وہ کتابیں الماری میں رکھنے کے لیے انہیں ترتیب دے رہے تھے کہ امی کی آواز آئی: ''بچو! اب آ جاؤ۔ ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

ان کا جی تو نہیں چاہتا تھا مگر امی کی آواز سن کر بیٹھے بھی تو نہیں رہ سکتے تھے۔ جلدی جلدی ناشتا کر کے واپس آ گئے اور پھر کتابوں کو الماری کے اندر رکھنے کے لیے دو دو تین تین کتابیں اُٹھا لیں۔ ابھی وہ الماری کی طرف بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ احمد اور اس کی بہن زیبا آ گئی۔ یہ دونوں بھی اس اسکول میں پڑھتے تھے جہاں سلیمان اور نوشی پڑھتے تھے۔ احمد سلیمان کا ہم جماعت تھا اور زیبا، نوشی کی۔ انہیں دیکھ کر سلیمان اور نوشی رُک گئے۔

''ہم نئی کتابیں دیکھنے کے لیے آئے ہیں۔'' احمد بولا۔

سلیمان اور نوشی نے جو کتابیں اُٹھا رکھی تھیں، وہ میز پر باقی کتابوں کے پاس رکھ دیں۔

''تم نے اپنی کتابیں نہیں خریدیں؟ دکانوں پر تو آچکی ہیں۔''
دونوں میں سے کسی نے کچھ نہ کہا۔ نوشی کہنے لگی:
''ہمارے ابو کل شام دفتر سے آتے ہوئے میری اور سلیمان کی ساری کتابیں اور کاپیاں لے آئے تھے۔ تمہارے ابو نہیں لائے؟''
''لے آئیں گے۔'' احمد نے جواب دیا۔
''کب؟''
''ہمارے ابو فیکٹری میں چھٹی کے بعد جو کام کرتے ہیں، اس کے پیسے ذرا دیر سے ملتے ہیں۔ کچھ دن بعد ملیں گے تو خرید لیں گے۔'' یہ الفاظ زیبا نے کہے تھے اور اس کے لہجے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اسے یہ کہتے ہوئے شرمندگی ہوئی ہے۔
احمد اور زیبا ایک ایک کتاب دیکھنے لگے۔ شوق اور دلچسپی تو ان میں بھی تھی مگر اس کے ساتھ قدرے مایوسی بھی تھی۔ دس بارہ منٹ کے بعد وہ چلے گئے۔
''نوشی!'' سلیمان بولا۔
''ہوں۔''
''تم نے دیکھا جاتے ہوئے وہ کتنے مایوس تھے۔''
''مایوس تو ہونا ہی تھا۔ ہمارے پاس کتابیں ہیں اور ان کے پاس نہیں ہیں۔''
''ان کے ابو نہیں خرید سکے ناں۔''
''کیسے خریدتے؟ تھوڑی سی تنخواہ ہے۔ گھر ہی میں خرچ ہو جاتی ہے۔ اسی لیے بے چارے کئی کئی دن راتوں کو گھر نہیں آتے۔'' سلیمان نے کہا۔ دونوں خاموش ہو گئے۔ وہ کچھ سوچنے لگے تھے۔
''سلیمان!'' چند منٹ بعد نوشی بولی۔
''کہو۔''
''ہم ایک دوسرے کے پرانے دوست ہیں۔ ایک ساتھ اسکول جاتے ہیں۔ ایک ساتھ واپس آتے ہیں۔ دوست دوست کے کام آتا ہے۔'' سلیمان نے فقرہ مکمل کر کے اپنی بہن کو دیکھا۔
''تم ٹھیک کہتے ہو، سلیمان۔ ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے۔''
''کس طرح؟''
''یہ بھی کوئی مشکل بات ہے؟ انہیں ان کتابوں کی ضرورت ہے۔ ان کے ابو نہ جانے کب خریدیں گے۔ پھر ان پر بوجھ بھی تو پڑے گا ناں۔''
''بالکل درست۔''
''ایسا نہ کریں کہ ہم اپنی کتابیں انہیں دے دیں؟''
''اور خود کیا کریں؟''
''خود کیا کریں؟ خود یہ کریں کہ ہم نے جو پیسے جمع کر رکھے ہیں، ان سے کتابیں خرید لیں۔''
''واہ وا! کیا اچھی تجویز ہے۔ میرے دل کی بات کہی تم نے!''
سلیمان پھر کچھ سوچنے لگا۔ نوشی نے پوچھا: ''اب کیا سوچ رہے ہو، سلیمان؟''
''کتابیں دیتے وقت کہیں گے کیا ان سے؟''
''آج نئے سال کا پہلا دن ہے ناں۔''
''ہاں! ہے تو۔''
''کہیں گے یہ نئے سال کا تحفہ ہے۔''
سلیمان اُچھل پڑا۔ ''واہ وا! یہ بات ہوئی ناں مگر......''
''مگر کیا؟''
''ابو امی......؟'' نوشی نے فکرمندی کا اظہار کیا۔
''ہاں، یہ بھی تو ایک مسئلہ ہے!'' سلیمان بولا۔
''میرا خیال ہے، وہ برا نہیں مانیں گے۔'' نوشی نے یقین سے کہا۔
''میرا بھی یہی خیال ہے۔ ہم ان سے اجازت لے لیں گے۔''
''اجازت نہ دی تو؟'' نوشی بولی۔
''ضرور دے دیں گے۔''
''سوچ لو! نہ دی تو؟''
یہ بات ہو رہی تھی کہ ان کے امی ابو آ گئے۔
''کیا بات ہے؟ یہ اجازت کا کیا مسئلہ ہے؟'' ابو نے پوچھا۔
''کہہ دو ناں سلیمان۔'' نوشی بولی۔
''تم کہہ دو۔''
''اچھا، میں ہی کہہ دیتی ہوں۔'' اور نوشی نے ابو امی کو سارا معاملہ بتا دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ وہ اپنی کتابیں اپنے پیسوں سے

خریدیں گے۔

ابو بولے: ''جو مناسب سمجھو، کرو! ہم تو یہ دیکھنے آئے تھے کہ تم نے کتابیں الماری میں رکھ دی ہیں یا نہیں۔''

''اجازت تو مل گئی ہے۔'' ابو اور امی چلے گئے تو نوشی نے خوشی سے کہا۔

''ہاں! ابو نے کہہ دیا ہے، جو مناسب سمجھتے ہو، کرو۔ اب انہیں دے آتے ہیں کتابیں۔''

''سلیمان! اسٹور روم میں وہ بڑا سا تھیلا ہے ناں، جس میں سودا لاتے ہیں، وہ لے آؤ۔''

''کس لیے؟''

''کیسے بدھو ہو! سمجھ نہیں سکے۔ اس میں کتابیں ڈال کر لے جائیں گے۔''

''ٹھیک، ٹھیک۔'' سلیمان تھیلا لے آیا۔ دونوں نے اپنی اپنی کتابیں تھیلے میں ڈالیں اور تھیلا اُٹھا کر لے گئے۔

دو گھنٹے کے بعد واپس آئے تو امی نے کہا: ''اتنی دیر؟''

''امی!'' نوشی کہنے لگی۔ ''وہ کتابیں لیتے ہی نہیں تھے۔ آخر خالہ جان نے انہیں سمجھایا، لے لو بچو۔ تمہارے دوست نئے سال کا تحفہ دے رہے ہیں...... لے لو۔''

''انہوں نے ہمیں پُر تکلف چائے بھی پلائی۔ اس لیے دیر ہو گئی۔'' ابو امی سے گفتگو کر کے وہ اپنے کمرے میں آ گئے۔

''ارے یہ کیا؟'' نوشی کے منہ سے نکلا۔

''کیا ہے؟'' سلیمان نے پوچھا۔

''میز پر دیکھ نہیں رہے؟''

دونوں تیزی سے آگے بڑھے۔ میز پر سلیمان اور نوشی کی کتابوں کے ساتھ مٹھائی کا ایک ڈبا بھی پڑا تھا۔

''یہ سب کچھ کہاں سے آ گیا؟''

اسی لمحے ابو امی مسکراتے ہوئے آ گئے۔ ''یہ ہم لائے ہیں۔ تم نے اپنے دوستوں کو نئے سال کا تحفہ دیا ہے۔ یہ ہماری طرف سے تمہارے لیے نئے سال کا تحفہ ہے۔ ہمیں بھی تو تحفہ دینا تھا۔''

''شکریہ ابو، امی!'' دونوں بیک وقت بولے اور کتابوں کو دیکھنے لگے۔ خوشی سے ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔

☆☆☆

محمد عرفان رامے

پیروڈی

سب لوگ میرے کمرے میں جمع تھے اور گھر بھر سے چیزیں اکٹھی کر کے کمرے میں فلم کا سیٹ لگایا گیا تھا۔

''پہلا سین کیا ہے؟'' عینی نے میک اَپ کرتے ہوئے پوچھا۔

''پہلا سین یہ ہو گا کہ ولید عینی کے ہاتھ سے پرس چھین کر بھاگے گا اور عینی چور چور کا شور مچائے گی۔ عینی کا شور سن کر طاہر، ولید کے پیچھے بھاگے گا اور گھر کے صدر دروازے کے قریب پہنچ کر اسے قابو کر لے گا۔'' میں نے تفصیل سمجھائی اور تینوں کو مختلف جگہ کھڑا کر دیا۔

''ریڈی...... لائٹ، کیمرہ، پلے بیک، ایکشن!'' میں نے میز پر کھڑے ہو کر کیمرہ کندھے پر رکھا اور ماہرانہ انداز میں ہدایات دیں۔

''اوئی اللہ......''

''کٹ...... کیا ہو گیا ہے گلو؟''

''صاحب، ٹیبل لیمپ کے بٹن میں کرنٹ ہے۔'' وہ ٹوٹا ہوا ٹیبل لیمپ میز پر رکھ کر ہاتھ سہلانے لگا۔

''تمہیں کس نے کہا تھا بٹن پر انگلی رکھو...... اب احتیاط کرنا اور بچاؤ کے لیے ہاتھ پر کپڑا لپیٹ لو۔'' میں نے اسے ڈانٹا۔

''جی بہتر......'' وہ جوشیلے انداز میں بولا۔

''اوکے! سب لوگ دوبارہ تیار ہو جائیں۔ لائٹ، کیمرہ، ایکشن!''

''ارے عینی! میری عینک کہاں رکھ دی ہے تم نے، مل نہیں رہی۔'' دادی اماں غیر متوقع طور پر کمرے میں داخل ہوئیں۔

''کٹ......'' میں نے جھلا کر کہا۔

''دادی اماں! عینک آپ کے ہاتھ میں ہی ہے۔'' سلمیٰ نے تیزی سے جواب دیا۔

''لو بھئی، کیسا بڑھاپا آ گیا ہے، عینک ہاتھ میں اور ڈھنڈورا پورے گھر میں......'' دادی اماں نے خود کو کوستے ہوئے چشمہ لگایا۔

''ہائے میں مرگئی، یہ کیا ہو رہا ہے؟ عینی تو کیوں بنی ٹھنی کھڑی ہے اور یہ کم بخت ولید سے میں پوچھتی ہوں کہ اس کے منہ پر کیوں پھٹکار برس رہی ہے۔ قسم سے بالکل غنڈہ لگ رہا ہے۔'' دادی اماں نے توبہ توبہ کرتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

''دادی اماں، یہاں شوٹنگ ہو رہی ہے اور یہ دونوں میک اَپ میں ہیں۔'' میں نے انہیں سمجھانا چاہا۔

''تو کیا اب گھر میں بھی ڈرامے ہوں گے...... باپ نے امریکہ سے فلمیں بنانے والا کیمرہ کیا بھجوا دیا، تم نے گھر میں ہی ناٹک شروع کر دیا۔ آنے دے تیری ماں کو سب کچھ بتاؤں گی۔'' انہوں نے لمبی تقریر کے بعد ایک بڑی دھمکی دی اور بڑبڑاتی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

......☆......

جون کا مہینہ، دوپہر دو بجے کا وقت اور ہر قسم کے سائے سے محروم کھلی چھت۔ اس روز سورج یقیناً سوا نیزے پر تھا۔ عینی اور سلمٰی کے میک اَپ زدہ چہروں سے پسینہ دھاروں کی صورت میں کچھ یوں رواں تھا جیسے تیز آندھی چلنے کے بعد ہلکی بارش سے نئی قلعی شدہ دیوار پر نقش و نگار بن گئے ہوں۔ ولید اپنے کردار کے مطابق شرٹ کے بٹن کھول کر کان میں سلمٰی کی بالی پہنے پان چبا رہا تھا۔ طاہر کونے میں اپنی چھوٹی سی چھتری تلے سمٹا برف کا گولا کھا رہا تھا اور گلو فائر بریگیڈ انجن کی طرح جگ اُٹھائے سب کو پانی پلانے میں مصروف تھا۔ سب سے مشکل کام میرا تھا، میں کیمرہ چھت کے مختلف حصوں پر رکھ کر کسی بہتر لوکیشن کا انتخاب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ہاں! تو سین یہ ہے کہ ولید اچانک عینی کے سامنے آ کر بے ہودہ انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے بتائے گا کہ اس نے طاہر کو اغواء کر لیا ہے اور اگر ایک لاکھ روپے ادا نہ کیے گئے تو وہ طاہر کو چھوڑ دے گا۔'' میں نے ایک مناسب جگہ کا انتخاب کرنے کے بعد باقی لوگوں سے خطاب کیا۔

''یہ چھوڑ دے گا، کیا مطلب ہے؟'' میری بات مکمل ہوتے ہی طاہر بولا۔

''اس لیے کہ تمہارے کرتوت ہی ایسے ہیں، کوئی تمہیں اغواء کروانے کے لیے تو لاکھ روپے خرچ سکتا ہے، بچانے کے لیے ہرگز نہیں۔'' میں نے وضاحت کی اور سب کو مزید ہدایات دینے لگا۔

''اوکے...... سب تیار ہو جائیں۔ ریڈی...... کیمرہ...... ایکشن۔'' میں نے انہیں سمجھاتے ہی پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''ہاہاہا......'' ابھی ولید کا قہقہہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ گلو کی چیختی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی:

''ولید بھائی کٹی پتنگ......'' فقرہ سنتے ہی ولید کی نظریں آسمان پر اُٹھیں اور اس کٹی پتنگ پر جا رکیں جو ساتھ والی چھت پر گرنے والی تھی۔ ہمیشہ کی طرح پتنگ دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک ختم ہو گئی اور وہ شوٹنگ کو خدا حافظ کہہ کر کسی کی سنے بغیر دیوار پھلانگ کر حمید صاحب کی چھت پر کود گیا۔

ابھی وہ پتنگ تک پہنچا ہی تھا کہ حمید صاحب کا پالتو کتا بھی سیڑھیاں چڑھتا چھت پر آ پہنچا اور بھونکتا ہوا ولید کی جانب بڑھا۔ خون خوار کتے پر نظر پڑتے ہی ولید کا رنگ فق ہو گیا اور وہ بچاؤ بچاؤ کا شور مچاتا اُلٹے پاؤں واپس پلٹا۔

''ولید، تیز بھاگو، کتا کاٹ لے گا...... اور تیز......'' ہم سب چیخ چیخ کر اسے زندگی کی طرف واپس بلانے لگے۔ اس نے بھاگتے بھاگتے مُڑ کر کتے کی طرف دیکھا اور جست لگا کر ٹوٹی ہوئی منڈیر پر چڑھ گیا لیکن اسی دوران کتا اس کی ٹانگ دبوچنے میں کام یاب ہو چکا تھا۔ پھر اچانک اس کا توازن بگڑا اور وہ بے جان پتھر کی طرح ہوا میں تیرتا ہوا چھت سے گلی میں جا گرا۔ اس کے آخری لفظ ''بچاؤ'' کی بازگشت ہماری چیخوں میں گم ہو چکی تھی۔

اس اچانک حادثے کے بعد چند لمحے ہم سب بُت بنے حیرت کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر طاہر نے ہمت کر کے منڈیر کے پار سنسان گلی میں جھانکا:

''ولید بچ گیا......'' اس کے غیر متوقع نعرے نے سب میں نئی روح پھونک دی۔ ہم سب نے جلدی سے آگے بڑھ کر گلی میں دیکھا تو بے اختیار ''اللہ تیرا شکر ہے'' کے الفاظ زبان پر آ گئے۔ ولید گلی میں پڑے کچرے کے بڑے سے ڈرم میں بیٹھا روئے چلا جا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے کیمرہ آن کیا اور زندگی کے ان ناقابلِ فراموش لمحات کو ہمیشہ سے کیسٹ میں قید کر لیا۔

یہ کل کی بات تھی۔ آج ولید پتنگ نہیں جہاز اُڑا رہا ہے اور اپنے پیارے دیس کی فضاؤں کا محافظ ہے کیوں کہ حادثے کے بعد اس نے عہد کیا تھا کہ کبھی زمین پر کھڑے ہو کر فضا میں اُڑتی پتنگ کا تعاقب نہیں کرے گا، بلکہ محنت کر کے اس مقام تک پہنچے گا کہ فضا میں اُڑ کر زمین پر بسنے والوں کی حفاظت کر سکے۔

احتیاط کیجیے! بہت احتیاط کہ کاغذ کا یہ حقیر ٹکڑا جسے پتنگ کہا جاتا ہے، زندگی کی انمول شوٹنگ پیک اَپ کر دے۔

☆☆☆

اَلْبَرُّ جَلَّ جَلَالُہٗ (اپنے بندوں پر مہربان)

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے آسانی فرماتے ہیں، تنگی نہیں چاہتے۔ ان کے بہت سے گناہوں کو اپنے فضل سے معاف فرما دیتے ہیں۔ ایک نیکی کے بدلے دس نیکیوں کے برابر بدلہ دیتے ہیں۔ اگر کوئی نیکی کرنے کا ارادہ کرلے تو وہ نیک کام کیے بغیر بھی نیکی لکھی جاتی ہے، جب کہ بُرائی کا ارادہ کرنے پر کچھ نہیں لکھا جاتا۔

یہ مبارک نام قرآن کریم میں صرف ایک مرتبہ آیا ہے۔

عزیز ساتھیو! اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کیسے کیسے بھلائی فرماتے ہیں۔ وہ ہم پر بہت مہربان ہیں۔ ہمارے لیے آسانی والا معاملہ فرماتے ہیں۔ ایک نیکی کرنے پر دس نیکیوں کے برابر ثواب دیتے ہیں۔ اس کے ہم پر بہت احسانات ہیں۔ ہمیں اس نے طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا ہے۔

آٹھ سو درہم

''جناب! یہ گھوڑا آپ کے لیے تین سو درہم کا خریدا ہے۔ اس کے مالک کو یہ رقم دینی ہے۔'' خادم نے آکر ایک صحابی حضرت جریرؓ سے آکر کہا۔

حضرت جریرؓ نے گھوڑے کی طرف دیکھا اور کہا: ''یہ اعلیٰ نسل کا گھوڑا تین سو درہم کا تو نہیں بلکہ اس سے زیادہ کا ہے۔''

گھوڑے کا مالک یہ سن کر حیران رہ گیا کہ ایسا تو کہیں بھی نہیں ہوتا، جس نے کچھ خریدنا ہوتا ہے وہ کم قیمت دینے کی کوشش کرتا ہے۔

''آپ کے گھوڑے کی قیمت تین سو درہم سے زیادہ ہے۔ کیا آپ چار سو درہم میں یہ گھوڑا فروخت کریں گے؟'' حضرت جریرؓ نے پوچھا۔

''جیسے آپ کی مرضی؟'' گھوڑے والے نے جواب دیا اور پھر حضرت جریرؓ گھوڑے کی قیمت بڑھاتے رہے اور آٹھ سو درہم میں وہ گھوڑا خرید لیا اور رقم مالک کے حوالے کر دی۔

''جناب! آپ نے اتنی رقم کیوں دی، جب کہ وہ مالک تین سو درہم پر راضی تھا تو آٹھ سو درہم دے کر اتنا نقصان کیوں مول لیا؟'' خادم نے حیران ہو کر پوچھا۔

''دراصل گھوڑے کے مالک کو اس کی صحیح قیمت کا اندازہ نہیں تھا۔ میں نے خیر خواہی کرتے ہوئے اس کی پوری قیمت ادا کی ہے، کیوں کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ میں نے ایک وعدہ کیا تھا کہ ہمیشہ ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کروں گا۔ میں نے اپنا وہ وعدہ پورا کیا ہے۔''

اَلتَّوَّابُ جَلَّ جَلَالُہٗ

(توبہ کی توفیق دینے والا اور توبہ قبول کرنے والا)

اَلتَّوَّابُ جَلَالُہٗ وہ ہیں جو بندے کو توبہ کرنے کی توفیق دیتے ہیں اور توبہ قبول بھی فرماتے ہیں۔ جتنی مرتبہ توبہ کی جائے اتنی مرتبہ وہ توبہ قبول فرماتے ہیں۔

یہ مبارک نام قرآنِ کریم میں دس مرتبہ آیا ہے۔ اگر کسی سے ایسی بات ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف تھی، پھر اسے احساس ہو جائے اور شرمندگی ہو جائے۔ جیسے جھوٹ بولنا منع ہے، پھر غلطی سے بول لیا۔ اب احساس ہوا کہ جھوٹ نہیں بولنا چاہیے تھا۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے کہ ''یااللہ! میں توبہ کرتا ہوں، اپنی غلطی پر شرمندہ ہوں، آئندہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔'' اس کو توبہ کرنا کہتے ہیں۔ توبہ کرنے کے بعد اگر دوبارہ جھوٹ بول لیا تو پھر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لے، توبہ کر لے۔ اللہ تعالیٰ کو توبہ کرنے والے بہت پسند ہیں۔

سخی دروازہ

بنی اسرائیل ایک قوم کا نام ہے، اس قوم میں ایک شخص تھا جس نے ننانوے انسانوں کو قتل کیا تھا۔ وہ ایک عیسائی پادری کے پاس آیا اور اس سے پوچھا: ''کیا میری توبہ قبول ہو جائے گی؟''

اس پادری نے جواب دیا: ''نہیں! کیوں کہ تو نے بہت قتل کیے ہیں۔ تیری مغفرت نہیں ہو گی۔''

اس نے اس عیسائی پادری کو بھی قتل کر دیا، اب وہ شخص توبہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کئی لوگوں سے پوچھا، پھر ایک عالم سے پوچھا تو اس نے کہا: ''تیری توبہ قبول ہو جائے گی، مگر توبہ پکی ہونی چاہیے۔ فلاں بستی میں جا، وہاں نیک لوگ رہتے ہیں۔''

وہ قاتل اس بستی کی طرف جانے لگا، راستے میں موت کا وقت آ گیا۔ اس نے اپنے سینے کا رُخ اس بستی کی طرف کر لیا اور اس بستی کی طرف جاتے جاتے اس کا راستے میں انتقال ہو گیا۔ رحمت کے فرشتے اور عذاب کے فرشتے دونوں آ گئے۔ رحمت والے فرشتے کہنے لگے کہ اسے ہم لے جائیں گے، کیوں کہ یہ توبہ کرنے کے لیے چل پڑا تھا اور عذاب والے فرشتے کہنے لگے کہ اسے ہم لے جائیں گے، کیوں کہ ابھی یہ اس بستی تک نہیں پہنچا۔ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے فرشتوں اور عذاب کے فرشتوں کا اختلاف ختم کرنے کے لیے ایک فرشتہ بھیجا، اس نے آ کر کہا:

''دونوں بستیوں کی پیائش کر لو! اگر نیک لوگوں کی بستی دُور ہے اور گناہوں والی بستی قریب ہے تو عذاب کے فرشتے لے جائیں اور اگر نیک لوگوں کی بستی قریب ہے تو رحمت کے فرشتے لے جائیں۔''

اگرچہ صحیح بات یہ تھی کہ نیک لوگوں کی بستی دُور تھی، اللہ تعالیٰ نے نیک لوگوں کی بستی کو حکم فرمایا کہ ''اس توبہ کرنے والے کے قریب ہو جا۔'' اور گناہوں والی بستی کو حکم دیا کہ ''تُو دُور ہو جا۔''

کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی توبہ پسند آئی اور وہی تو ہیں جو توبہ کی توفیق دیتے ہیں اور پھر توبہ کو قبول بھی فرما لیتے ہیں۔ فرشتوں کو بستیوں کی پیائش کا حکم دیا۔ یہ اس کی طرف سے اس کا عدل و انصاف تھا اور خود نیک بستی کو حکم فرما رہے ہیں کہ قریب ہو جا۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت تھی کہ اس کو معاف کرنے اور اس کی توبہ قبول کرنے کے بہانے تلاش کر رہی تھی۔

چناں چہ جب زمین کی پیائش کی گئی تو وہ شخص نیک لوگوں کی بستی کے زیادہ قریب تھا۔ اس قریب ہونے پر اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول فرما کر اس کی مغفرت فرما دی۔

رَبَّنَا

کبھی کوئی گناہ ہو جائے اور اس گناہ کرنے پر ندامت ہو جائے تو آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم کر کے اللہ تعالیٰ سے اس طرح معافی مانگے۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ

ترجمہ: ''اے ہمارے پروردگار! ہم اپنی جانوں پر ظلم کر گزرے ہیں اور اگر آپ نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم نامراد لوگوں میں شامل ہو جائیں گے۔''

یہ دعا حضرت آدم و حوا علیہم السلام نے مانگی تھی۔

اہم باتیں

1- جب بھی ہم سے گناہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ سے توبہ کر لیں۔ توبہ کرتے وقت گناہ کرنے پر شرمندگی ہو۔ اس گناہ کو چھوڑ دیا جائے اور آئندہ نہ کرنے کا عزم ہو۔

2- اگر توبہ بار بار ٹوٹ جائے تو ہم پریشان نہ ہوں۔ جتنی مرتبہ توبہ کریں گے، اللہ تعالیٰ اتنی مرتبہ ہی توبہ قبول فرمائیں گے بلکہ وہ توبہ کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے اور ان سے خوش ہوتا ہے۔

3- اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بالکل مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اس کی رحمت تو معاف کرنے کے بہانے تلاش کرتی ہے۔ ☆☆

غلام حسین میمن

باغی.... مولانا محمد علی جوہر

شیر گرج رہا تھا۔ اس کے ہر ہر لفظ میں حکومت کے خلاف بغاوت ٹپک رہی تھی۔ یہ دور ہندوستان کی غلامی کا دور تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی انگریزوں کی غلامی سے نجات کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ ان ہی دنوں ایک واقعے نے مسلمانوں میں بے چینی پیدا کر دی۔ مسلمانوں کی عظمت اور شان وشوکت کی علامت وہ خلافت عثمانیہ تھی جو ترکی سے لے کر مکے اور مدینے تک وسیع تھی۔ غیروں کی سازشیں اس خلافت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہ رہی تھیں تاکہ مسلمانوں کی طاقت کو بکھیر کر رکھ دیا جائے۔ اس خلافت کو بچانے کے لیے سب ہی اپنی سی کوششیں کر رہے تھے۔

21 مارچ 1921ء کو کراچی کے عیدگاہ میدان میں ''باغی'' گرجا: ''مجھے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کی اُمید اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ آپ کے دلوں میں ہمت اور مردانگی ہو اور آزادی سے محبت بھی۔ اگر آپ غلامی سے بھاگتے ہیں تو آپ کو موجودہ طرزِ حکومت سے نفرت اور بُرائی ہونی چاہیے۔''

یہ محض تقریر نہ تھی بلکہ باغی کی جانب سے حکومت کو ہلانے کی سازش قرار دی گئی۔ اس جرم میں وہ اور اس کے تمام ساتھی گرفتار کر لیے گئے اور کراچی کے ایم اے جناح روڈ پر واقع غلام حسین خالق دینا ہال میں مجسٹریٹ کی عدالت میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔

کارروائی کے آغاز والے دن ہال کے اردگرد خاردار تار لگائے گئے تھے اور چاروں طرف مسلح پولیس اور فوج موجود تھی۔ ہال میں ایک مشین گن بھی نصب تھی۔ حاکموں کو ڈر تھا کہ ان نہتے ملزمان کے غریب ساتھی کہیں انہیں چھڑا کر نہ لے جائیں۔ ملزمان کو بند گاڑی میں لایا گیا جس کے آگے پیچھے ہندوستانی اور انگریز سپاہی اسلحہ کے ساتھ موجود تھے۔ ملزمان کے عدالت میں داخل ہوتے ہی عدالت کے احاطے میں نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

یہ صبح کے گیارہ بجے تھے، جب ملزمان میں سب سے پہلے ''باغی'' داخل ہوا جس کے ہاتھ میں قرآن اور روشنائی کی بوتل تھی۔ اس کے پیچھے دیگر اکابرین بھی ہنستے مسکراتے داخل ہوئے۔ سب کے چہرے بے حد مطمئن اور مسرور تھے۔ ملزمان پر الزامات لگائے گئے اور جواب میں دفاع کرنے کے لیے ان سے کہا گیا۔ انہوں نے عدالتی کارروائی میں حصہ لیا اور نہ ہی اپنے دفاع میں کچھ کہا اور پھر ''باغی'' عدالت میں گرجا: ''اسلام میں صرف ایک ہی بادشاہی تسلیم کی گئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی بادشاہت ہے جو بغیر کسی تقسیم، شرط اور تبدیلی کے ہے۔ اگر آج ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس طاقت ہوتی تو وہ موجودہ حکومت سے اعلانِ جہاد کرنے پر مجبور ہو جاتے اور آج کا یہ فیصلہ خالق دینا ہال کے بجائے کسی اور جگہ کسی اور ہی انداز میں ہو رہا ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں آج کے مسلمانوں کو ہجرت کرنی چاہیے جہاں ان کے مذہبی عقائد کے خلاف کوئی وکیل سرکار انہیں پریشان نہ کر سکے۔''

یہ مجسٹریٹ کی عدالت تھی۔ ابتدائی کارروائی کے بعد مقدمہ سیشن عدالت کے سپرد ہوا جہاں اس ''باغی'' نے اعتراف کیا:

''ہاں میں مجرم ہوں۔ جو الزامات مجھ پر لگائے گئے ہیں، ان سے کہیں زیادہ جرم میں نے کیے ہیں اور میں ان کا اعتراف کرتا ہوں۔ عدالت جو چاہے مجھے سزا دے، ہمیں آج قیدیوں اور ملزموں کی حیثیت میں کھڑے کرنے والے یاد رکھیں کہ جس خدا کی عدالت میں روزِ محشر خود جج، جیوری، وکلاء اور بادشاہ کھڑے ہوں گے تو سوچیے اس وقت ان کی کیا حالت ہوگی۔ میں ذاتی دشمنی میں تو ایک مچھر بھی

نہیں مار سکتا، مگر اللہ کی راہ میں ہر ظالم کو قتل کروں گا، یہاں تک کہ اپنے بھائی اور بوڑھی ماں کو بھی قربان کرنے سے دریغ نہ کروں گا۔"
باغی کو دو سال قید بامشقت کی سزا ہوئی اور دیگر بھی سزا کے حق دار ٹھہرے۔ ان دنوں جیل سے باہر یہ شعر ہر ایک کی زبان پر تھا۔
بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو
یہ "باغی" مولانا محمد علی جوہر تھے، جن کے ہمراہ اس مقدمے میں ان کے بھائی مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر کچلو اور مولانا نثار احمد کانپوری تھے۔ ان کی والدہ آبادی بیگم، بی اماں کے لقب سے زیادہ مشہور تھیں۔ یہ بی اماں کی تربیت کا انداز تھا کہ ان کے دونوں بیٹے مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی ہندوستان کی آزادی کے مطالبے سے کبھی پیچھے نہ ہٹے اور نہ ہی اس سلسلے میں اپنی جان کی پرواہ کی۔
مولانا محمد علی جوہر 10 دسمبر 1877ء کو رامپور میں پیدا ہوئے۔ ابھی دو سال ہی عمر تھی کہ والد عبدالعلی خان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی والدہ آبادی بیگم نے ہمت نہ ہاری اور تمام بچوں کی پرورش استقامت کے ساتھ کی۔ انہوں نے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ مولانا محمد علی جوہر نے جب ہوش سنبھالا تو خود کو انگریزوں کی غلامی میں پایا۔ آزادی کی تڑپ ان کے دل میں شروع ہی سے موجود تھی۔ انہوں نے اس سلسلے میں تقریر کے ساتھ ساتھ اپنے قلم کا بھرپور استعمال کیا۔ انہوں نے اس کے لیے انگریزی میں ہفت روزہ "کامریڈ" جاری کیا۔ یہ ہفت روزہ بہت جلد اپنی خوب صورت انگریزی اور سنجیدہ مضامین کی بدولت ہر خاص و عام میں مقبولیت حاصل کر گیا۔ اس وقت کے وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ کی بیگم نے اخبار اپنے نام علیحدہ سے جاری کرایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پہلا اخبار تھا جس نے برطانوی حکومت کی پالیسیوں پر بے لاگ تنقید کی اور قلمی جہاد میں بھرپور حصہ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ عوام نے انہیں "رئیس احرار" (حروں کے سردار) کا خطاب دیا۔ اس کے بعد انہوں نے حکیم محمد اجمل خان کے مشورے سے اُردو داں طبقے کے لیے "ہمدرد" جاری کیا۔ اس اخبار میں ایک مضمون کی اشاعت پر انہیں قید کی سزا ملی، مگر ان کے ارادوں اور انگریزوں سے بغاوت کے رویے میں کوئی کمی نہ آئی۔ واضح رہے کہ یہ پہلی جنگ عظیم کا دور تھا جو 1914ء سے شروع ہو کر 1918ء میں ختم ہوا۔
1928ء میں ہندو رپورٹ کے آنے کے بعد قائداعظم محمد علی جناح اور مولانا محمد علی جوہر سمیت دوسرے رہ نماؤں کی ہندوؤں کے ساتھ مل کر رہنے کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ ان ہی دنوں حکومت کی جانب سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لیے لندن میں گول میز کانفرنس بلائی گئی جو ترتیب کے اعتبار سے پہلی گول میز کانفرنس تھی۔ دسمبر 1930ء کی سخت سردی کے موسم میں قائداعظم کے ساتھ ساتھ مولانا محمد علی جوہر کو بھی مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے دعوت دی گئی۔ اس وقت وہ سخت بیمار تھے۔ ڈاکٹروں نے بستر سے اُٹھنے کا سختی سے منع کیا تھا۔ ایسی صورت میں سفر کس طرح ممکن تھا، مگر انہوں نے صحت کی پرواہ نہ کی اور سفر کا ارادہ کر لیا۔ انہوں نے ہندوستان سے لندن تک کا سفر بری (زمینی) اور بحری (سمندری) ذرائع سے اسٹریچر پر طے کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمانوں کی نمائندگی کا یہ موقع میں نے اس وقت گنوا دیا تو شاید دوبارہ نہ ملے۔
لندن کی گول میز کانفرنس میں ایک بار پھر وہ باغی گرجا: "کوئی ذی ہوش انسان جسے اتنی شدید بیماریاں ہوں جو مجھے ہیں، وہ سات میل کے سفر کا تصور نہیں کر سکتا، جبکہ میں سات ہزار میل کا بحری اور بری سفر کر کے آیا ہوں۔ درحقیقت جب اسلام اور ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ ہو تو میں بے خود ہو جاتا ہوں۔ میرے یہاں آنے کا واحد مقصد یہ ہے کہ میں اپنے ملک کے لیے آزادی کا پروانہ لے کر جاؤں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں ایک غلام ملک میں واپس جانے کے بجائے ایک آزاد ملک میں مرنا پسند کروں گا۔ آپ کو یا تو ہندوستان کو آزادی دینا ہو گی یا پھر مجھے دو گز زمین اور پھر یہی ہوا۔ 4 جنوری 1931ء کو ان کا لندن میں انتقال ہو گیا۔ سارے عالم اسلام میں ان کا سوگ منایا گیا۔ کلکتہ، علی گڑھ، رامپور، اجمیر، لکھنؤ، دہلی کے سب شہریوں کا یہی اصرار تھا کہ انہیں ان کے شہر میں دفن کیا جائے۔ مفتیٔ اعظم فلسطین کی تجویز اور اصرار پر انہیں بیت المقدس میں دفن کیا گیا۔ ان کے انتقال پر علامہ اقبالؒ نے فارسی شعر کہا جس کا ترجمہ ہے: "بیت المقدس کی سرزمین نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ وہ اسی راستے سے آسمانوں کی طرف چلا گیا جس راستے سے پیغمبر گزرے تھے۔"
مشہور ناول نگار ایچ جی ولز نے کہا تھا: "محمد علی کا قلم میکالے کا قلم، محمد علی کی زبان برک کی زبان اور محمد علی کا دل نپولین کا دل تھا۔"
تقریر و تحریر کے ساتھ ساتھ وہ شاعری میں بھی اپنا منفرد مقام رکھتے تھے۔ ان کا یہ شعر آج بھی لوگوں کی زبان پر ہے:
قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ذہانت کی موت..... ارفع کریم

محمد یوسف وحید

ارفع کریم نے پاکستان کا نام ایسے وقت میں روشن کیا جب ارضِ پاک کو عالمی سطح پر دہشت گرد، دقیانوسی اور نجانے کن القابات سے یاد کیا جا رہا تھا مگر محض نو برس کی کم عمری میں سب سے بڑی سوفٹ ویئر کمپنی مائیکروسوفٹ کا آئی ٹی امتحان پاس کر کے ارفع کریم، دنیا کی کم عمر ترین آئی ٹی پروفیشنل کہلائی بلکہ اس نے پاکستان کا نام بھی روشن کیا۔ شاید وہ ہمیشہ سے جانتی تھی کہ اس کے پاس وقت بہت تھوڑا ہے، اسی لیے اس چھوٹی سی عمر میں وہ ایسا کارنامہ سرانجام دے گی جو ایک عام بندہ کر گزرنے میں کئی برس لگا دیتا ہے۔ محض سولہ برس کی عمر میں وہ اس دُنیا کو داغِ مفارقت دے گئی مگر اس باصلاحیت، ذہین فطین اور دوسروں کے لیے مشعل پاکستانی کو دُنیا ایک طویل عرصے تک یاد رکھے گی۔

ارفع کریم کا تعلق فیصل آباد کے ایک گاؤں رام دیوالی سے تھا، جب کہ اس کی پیدائش 1995ء میں پاک فوج کے ایک لیفٹیننٹ کرنل (ر) امجد کریم رندھاوا کے ہاں ہوئی۔ بچپن سے ہی پڑھائی میں بہترین ارفع کو کمپیوٹر سے خصوصی دلچسپی تھی۔ اس نے اپنی عمر کے دوسرے بچوں کی مانند کمپیوٹر کو محض گیمز کھیلنے یا چیٹنگ کے مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ اس کے سوفٹ ویئرز اور پروگرامنگ میں خصوصی دلچسپی دکھائی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے 2004ء میں مائیکروسوفٹ کی جانب سے لیے گئے ٹیسٹ میں کامیابی حاصل کی اور یوں وہ نو برس کی عمر میں مائیکروسوفٹ سرٹیفائیڈ پروفیشنل کہلائی۔ اس کی قابلیت نے دُنیا کے کمپیوٹر جینیئس اور مائیکروسوفٹ کے مالک بل گیٹس کو بھی بے حد متاثر کیا اور انہوں نے ارفع کو امریکہ آ کر اپنی کمپنی کے ہیڈ کوارٹر کے دورے کی دعوت دی۔ اُس کے کارنامے کی گونج عالمی میڈیا میں سنائی دی۔ 2005ء میں پاکستانی وزیراعظم شوکت عزیز نے ارفع کی خدمات کے صلے میں اس کو سائنس و ٹیکنالوجی کے شعبے میں فاطمہ جناح گولڈ میڈل عطا کیا۔ اسی برس صدر پاکستان پرویز مشرف نے بھی اس ہونہار کو پرائیڈ آف پرفارمنس سے نوازا جو پورے ملک کی جانب سے اس کو خراجِ تحسین تھا۔

ارفع کریم نے بین الاقوامی فورمز پر بھی پاکستان کی نمائندگی کی۔ اس کو دبئی کے آئی ٹی پروفیشنلز نے خصوصی دعوت پر دبئی بلایا جہاں اس کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں پاکستانی سفیر نے بھی خصوصی طور پر شرکت کی اور صدر پاکستان کی جانب سے نیک خواہشات کا پیغام پہنچایا۔ بعدازاں اس کو کئی میڈلز اور ٹرافی دی گئیں جب کہ ارفع کریم کو خصوصی طور پر دبئی فلائنگ کلب میں طیارہ اُڑانے کی دعوت دی گئی۔ اس وقت وہ محض دس برس کی تھی۔ اس کے نتیجے میں وہ اپنا پہلا فلائیٹ سرٹیفکیٹ حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ 2006ء میں ارفع کریم ایک دفعہ پھر مائیکروسوفٹ کی دعوت پر بارسلونا گئی جہاں اس نے ٹیک ایڈ ڈویلپمنٹ کانفرنس میں شرکت کی۔ اس کانفرنس کے 5000 شرکاء میں وہ واحد پاکستانی تھی۔

2011ء میں ارفع لاہور گرامر سکول میں اے لیولز کے دوسرے سال میں تھی جب اس کو اچانک دل کا دورہ پڑا اور وہ کومہ میں چلی گئی۔ اس کو لاہور کے کمبائنڈ ملٹری ہسپتال (سی ایم ایچ) میں داخل کروا دیا گیا۔ ڈاکٹروں کی خصوصی ٹیم اس کے معالجین کے طور پر مقرر تھی جب کہ وہ وینٹی لیٹر پر اپنی سانسیں لے رہی تھی۔ بل گیٹس نے ارفع کریم کے علاج میں خصوصی دلچسپی ظاہر کی اور امریکی ڈاکٹروں کی ایک ٹیم تشکیل دی جو ویڈیو کانفرنسنگ کے ذریعے اس کے علاج میں پاکستانی ڈاکٹروں کی معاونت کر رہی تھی۔ 14 جنوری کو ارفع کے والد کرنل رندھاوا کو فون کر کے اس کو فوری طور پر دبئی منتقل کرنے کی ہدایت کی جہاں امریکی ڈاکٹروں کی ایک ٹیم اس کے علاج کے لیے پہنچنے والی تھی مگر قسمت کو کچھ یوں ہی منظور تھا کہ وہ اس چھوٹی سی عمر میں اپنی قابلیتوں کی خوشبو بکھیرتی اس دُنیا سے رخصت ہو گئی۔ ارفع کی نمازِ جنازہ لاہور کے کیولری گراؤنڈ میں ادا کی گئی جس میں وزیراعلیٰ پنجاب سمیت زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ آسمان بھی اس جواں سال موت پر اشکبار تھا اور زمیں بھی اس کے لیے دعا گو تھی۔ ارفع کریم کو اس کے آبائی گاؤں رام دیوالی فیصل آباد میں منوں مٹی تلے سپردِ خاک کر دیا گیا۔ پاکستان کے روشن مستقبل کی ضمانت، صبح کا روشن ستارہ اور پاکستان کا ایک حسین چہرہ جس نے دُنیا بھر سے تحسین پائی، اچانک ڈوب گیا۔ اس سے بڑا نقصان کسی ملک و قوم کا کیا ہو سکتا ہے۔ وہ قوم کی ایک ایسی بیٹی تھی جو روشن مستقبل کی اُمید تھی۔ حکومتی سطح پر ارفع کریم کے مشن کو جاری رکھنے کے لیے ٹھوس منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔

کھوج لگایئے

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 رجنوری 2015ء ہے۔

نام: ____________

شہر: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 رجنوری 2015ء ہے۔

نام: ____________

مقام: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

ہونہار مصور

جنوری کا موضوع "نیا سال" ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 رجنوری 2015ء ہے۔

نام ____________ عمر ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ____________ شہر ____________

مقاصد ____________

موبائل نمبر: ____________

بوجھو تو جانیں

1- دُنیا میں ہے ایک خزانہ
اس کا مالک بڑا سیانا
اس کو ہاتھوں ہاتھ لٹائے
پر دولت بڑھتی ہی جائے

2- ہاتھ میں ڈنڈا نہ تلوار
ننھا سا ایک چوکی دار

اسامہ ظفر راجہ، جہلم

3- گڑ گڑ آؤں چھم چھم برسوں
خود باقی رہنے کو ترسوں

4- دیواروں سے ٹیک لگائے
روز ہی سب کو پاس بلائے

5- سبز چپاتی اوپر دال
سالن ساتھ سفید اور لال
اس پر دیکھو اور کمال
کھاؤ سبز اگلو لال

6- جب بھی وہ میدان میں آئے
قدم قدم پر ٹھوکر کھائے
اچھلے کودے دوڑے بھاگے
سب ہیں پیچھے وہ ہے آگے

7- کوئی نہ دیکھے اور دکھلائے
لیکن وہ سب کو تڑپائے

8- کرنے آئے من کی بات
جو بھی دیکھے مارے ہاتھ

9- دلی پہنچے، ڈھاکہ پہنچے، جا پہنچے قندھار
لندن، پیرس، برلن پہنچے، جائے سمندر پار
دنیا بھر کا چکر کاٹے اور نہ دیر لگائے
دیس دیس کی بولی بولے سب کا جی بہلائے

نور فاطمہ، لاہور

جوابات: 1-علم 2-تالا 3-بادل 4-کیلنڈر
5-پان 6-فٹ بال 7-درد 8-مچھر 9-ریڈیو

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ لفظ آدمؑ کا کیا مطلب ہے؟

i۔ خدا کا ستنا ii۔ عطیۂ خداوندی iii۔ راہ نما

2۔ نبیؐ کی ولادت کے دن شاہی محل کے کتنے کنگرے گر گئے تھے؟

i۔ 15 کنگرے ii۔ 14 کنگرے iii۔ 16 کنگرے

3۔ خالص ہیرے کا رنگ کیسا ہوتا ہے؟

i۔ سفید دودھیا ii۔ کوئی رنگ نہیں iii۔ زردی مائل نیلا

4۔ کوہ فیوجی دُنیا کا ایک مشہور ترین پہاڑ ہے۔ یہ کس ملک میں واقع ہے؟

i۔ چین ii۔ جاپان iii۔ فلپائن

5۔ کینگرو کس ملک میں پائے جاتے ہیں؟

i۔ چین ii۔ امریکہ iii۔ آسٹریلیا

6۔ وہ کیمیائی عمل جس میں حرارت جذب ہوتی ہے، کیا کہلاتا ہے؟

i۔ حرارت گیر کیمیائی عمل ii۔ عملِ تکسید iii۔ عملِ ادغام

7۔ بتایئے پہاڑ کسے کہا جاتا ہے؟

i۔ 1500 فٹ بلند ii۔ 3000 فٹ بلند iii۔ 2000 فٹ بلند

8۔ علامہ اقبالؒ نے رحیق کا لفظ اپنی نظم مسجدِ قرطبہ میں استعمال کیا ہے؟ مطلب بتایئے؟

i۔ کوچ، روانگی ii۔ پڑاؤ ڈالنا iii۔ منزل پانا

9۔ گدو بیراج پاکستان کے کس شہر میں واقع ہے؟

i۔ لاڑکانہ ii۔ کشمور (سکھر) iii۔ نواب شاہ

10۔ وٹامن K عام طور پر کن سبزیوں میں پایا جاتا ہے؟

i۔ ترش سبزیوں میں ii۔ سبز پتوں والی سبزیوں میں iii۔ گرم سبزیوں میں

جوابات علمی آزمائش دسمبر 2014ء

1۔ نظام الدین اولیاء 2۔ نائٹروجن 3۔ مرات خان 4۔ یوم الفرقان 5۔ علم فلکیات 6۔ لڑا دے ممولے کو شہباز سے 7۔ لیکو 8۔ پونچھنا یا ہاتھ پھیرنا 9۔ علامہ اقبالؒ 10۔ ڈیرہ اسماعیل خان

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ ندا خان، پشاور (150 روپے کی کتب)

☆ عدن سجاد، جھنگ (100 روپے کی کتب)

☆ محمد ثوبان، بہاول پور (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: مناہل نسیم، اسلام آباد۔ محمد عثمان، کاموکنے۔ زنیرا ہارون، نوشہرہ۔ ملیحہ وسیم انصاری، گوجرانوالہ۔ رامین رضوان، راول پنڈی۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ پروا محمود، جلھن، گوجرانوالہ۔ عبدالجبار رومی، لاہور۔ محمد عبداللہ ثاقب، پشاور۔ حلیمہ نشان، محمد نوید قادری، کنول شہزادی، محمد عامر منیر قادری، حسن رضا سردار، خدیجہ نشان، محمد نعمان قادری، گوہر دین قادری، محمد سمیع قادری، کاموکنے۔ ہمایوں رشید، اسلام آباد۔ محمد قمر الزمان صائم، خوشاب۔ محمد شبیہہ عباس، لاہور۔ محمد مالیان لیاقت جوئیہ، منچن آباد۔ مبشر، کوہاٹ۔ حسین احمد ورک، راول پنڈی۔ حافظ محمد زکوان، بہاول پور۔ طوبیٰ جاوید، بہاول نگر۔ حفصہ اعجاز، صوابی۔ محمد شوال ندیم، اوکاڑہ۔ مریم بتول، لاہور۔ نازیہ ندیم، راول پنڈی کینٹ۔ ارسلان الدین، کراچی۔ مریم اعجاز، لاہور۔ زینب ناصر، فیصل آباد۔ انیقہ فجر ظفر قریشی، میرپور، آزاد کشمیر۔ مریم نایاب، خوشاب۔ عزت مسعود، فیصل آباد۔ محمد ذیبان، بہاول پور۔ حذیفہ اویس، فیصل آباد۔ صباحت فاطمہ دختر محمد انور ندیم، اوکاڑہ۔ کومل صادق چوہدری، گوجرانوالہ۔ لائبہ نذیر۔ لاہور۔

ایک شخص بس میں سفر کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر ایک طالب علم بیٹھا ہوا تھا۔ طالب علم کا ہاتھ اتفاق سے اس شخص کی جیب کے ساتھ لگ گیا۔ اس شخص نے پوچھا: ''تم کیا کر رہے ہو؟''
طالب علم نے جواب دیا: ''میں گورنمنٹ ڈگری کالج سے ایف ایس سی کر رہا ہوں۔''

☆

شوہر (ٹیکسی ڈرائیور سے): ''اسٹیشن تک کا کیا کرایہ لو گے؟''
ٹیکسی ڈرائیور: ''بڑے فی سواری 20 روپے اور بچے مفت۔''
بیوی: ''تو پھر بچوں کو وہاں تک چھوڑ دو، ہم پیچھے آ رہے ہیں۔''

(قمر ناز دہلوی، کراچی)

کرائے دار (مالک مکان سے): ''میں اس مہینے کا کرایہ ادا نہ کر سکوں گا۔''
مالک مکان: ''آپ نے پچھلے مہینے بھی یہی کہا تھا۔''
کرائے دار: ''جناب! انسان کی زبان ایک ہونی چاہیے اور میں اب بھی اپنی زبان پر قائم ہوں۔'' (ایمن اعجاز، بارہ ہملٹ)

جج: ''دروازے پر پیروں کے نشان سے پتا چلتا ہے کہ تم نے کمرے کے اندر گھس کر چوری کی ہے۔''
چور: ''یہ غلط ہے، میں تو کھڑکی کے راستے سے اندر گیا تھا۔''

☆

ماں (بیٹے سے): ''کیا کر رہے ہو؟''
بیٹا: ''امی جان جغرافیے کے سوالات حل کر رہا ہوں۔''
ماں: ''بیٹا! اگر کچھ سمجھ نہ آئے تو پوچھ لینا۔''
بیٹا (تھوڑی دیر بعد): ''امی جان دریائے نیل کہاں ہے؟''
ماں: ''غسل خانے میں دیکھ لو صابن کے ساتھ رکھا ہو گا۔''
(محمد زبیر، جوہر آباد)

گاہک: ''یہ ٹائی کتنے کی ہے؟''
دکان دار: ''دو سو روپے کی۔''
گاہک: ''دو سو میں تو چپل کا جوڑا مل جاتا ہے۔''
دکان دار: ''ٹھیک ہے آپ چپل ہی خرید کر گلے میں لٹکا لیں۔''

☆

استاد: ''احمد! آج تم ایک آنکھ پر پٹی باندھ کر کیوں آئے ہو؟''
احمد: ''سر! آپ ہی نے تو کہا تھا کہ شریف لڑکے ہر امیر اور غریب کو ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔'' (عبدالرحمٰن، راول پنڈی)

پہلا دوست (کمزور نظر والے سے): ''تم عینک نہ پہنا کرو...... تم عینک پہن کر لنگور لگتے ہو۔''
کمزور نظر والا دوست: ''اگر میں یہ عینک اُتار دوں تو مجھے تم لنگور لگتے ہو۔''

☆

ڈاکٹر (نوکر سے): ''جلدی سے کسی ڈاکٹر کو بلاؤ میری طبیعت بہت خراب ہے۔''
نوکر: ''مگر آپ تو خود ڈاکٹر ہیں۔''
ڈاکٹر: ''بے وقوف تمہیں معلوم نہیں کہ میری فیس بہت زیادہ ہے۔''
(فرحین انور، احمد پور شرقیہ)

ایک صاحب ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔ ٹکٹ چیکر آیا اور ٹکٹ مانگا۔ ان صاحب نے ٹکٹ دکھایا۔
ٹکٹ چیکر: ''یہ ٹکٹ تو پُرانا ہے۔''
وہ صاحب بولے: ''تو ٹرین کون سی نئی ہے؟''

☆

ماں: ''بیٹا! یہ چمچ اور پلیٹ صبح صبح کہاں لے کر جا رہے ہو؟''
بیٹا: ''ابو نے کہا تھا کہ صبح کے وقت تازہ ہوا کھانا صحت کے لیے مفید ہے۔ وہی کھانے جا رہا ہوں۔'' (عاتکہ رحیم، جوہر آباد)

ایک صاحب (دوسرے سے): ''دیکھیے! میں کئی بار آپ سے شکایت کر چکا ہوں کہ آپ کا بیٹا میری نقل اُتارتا ہے، آپ اسے سمجھاتے کیوں نہیں؟''
دوسرے صاحب: ''اب نہیں کرے گا جناب! میں نے اسے سمجھا دیا ہے کہ بے وقوفوں جیسی حرکتیں مت کیا کرو۔'' (حافظ محمد فرخ حیات، پیر محل)

☆☆☆

کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے لیکن جب کھڑ کھاند گروپ کی شامت آئی تو اس نے پہاڑ کا رخ کیا۔ کھڑ کھاند گروپ کو اس بار عجیب سوجھی تھی۔ ساری شامتِ اعمال چھوٹے والا کی تھی لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں، اسی طرح چھوٹے والا کے ساتھ پورا کھڑ کھاند گروپ بھی رگڑا گیا۔

ایک دن بیٹھے بٹھائے چھوٹے والا نے اچانک کہا: ''دوستو! سنا ہے آج کل پہاڑ میں بہت شہد ملتا ہے، کل بھی دو آدمی کاٹ کر لا رہے تھے۔ کم از کم تین کلو تو ضرور ہو گا...... تو کیوں نہ ہم بھی کل شہد کاٹنے چلیں۔ مفت کا شہد کھانے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔''

مبارکاں کے منہ میں پانی بھر آیا: ''ہاں ہاں، ضرور چلو...... ناشتے میں بریڈ پر لگا کر کھایا کریں گے۔ شہد تو آج کل بہت مہنگا ہے۔''

''ونڈر فل آئیڈیا!'' گنجے والا نے چہک کر کہا۔ ''مگر یار، کاٹے گا کون؟''

''یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔'' دادا بڈی نے جھوم کر کہا۔ ''اس سالہ تجربہ ہے شہد کاٹنے کا!''

''اور ہم بھی کسی سے کم نہیں۔'' ملنگی نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا۔ ''بقولِ شاعر:

؎ عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں''

......اور اگلے دن کھڑ کھاند گروپ ایک عدد بالٹی لے کر پہاڑ کی طرف رواں دواں تھا۔

''بڑھے چلو مجاہدو، بڑھے چلو......!'' چھوٹے والا گنگنایا۔

''ہے جذبہ جنوں تو ہمت نہ ہار......!'' بڈی نے بھی تان اُڑائی۔

اسی طرح ہنستے مسکراتے کھڑ کھاند گروپ آخر کار پہاڑ کے دامن میں پہنچ گیا، جہاں ایک تالاب بارش کے پانی سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

دادا بڈی نے وہاں پہنچتے ہی اعلان کیا: ''بس دوستو! اب انتظار کی گھڑیاں ختم، اب شہد ڈھونڈنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ شہد کی مکھیاں ضرور یہاں سے پانی لینے آتی ہوں گی۔''

''اور یہ شہد کی مکھیوں نے ماشکیوں والا کام کب سے شروع کر دیا ہے؟'' مبارکاں نے دخل دیا۔

''جب سے امریکہ نے مکھیوں والا کام شروع کیا ہے، یعنی ڈرون حملے!'' ملنگی نے لقمہ دیا۔

''دیکھو اس! ڈرون نر مکھیوں کو کہتے ہیں، جن کے ڈنک ہوتے ہی نہیں۔ ڈرون اٹیک (Drone Attack) کا لفظ شہد کی مکھیوں سے نہیں نکلا۔'' گنجے والا نے اپنی علمیت کا رعب جھاڑنا ضروری سمجھا۔

"اوہو! یہ کیا فضول بحث لے کر بیٹھ گئے۔ جلدی آؤ اس طرف...... مجھے شک ہے کہ اس طرف قریب ہی کہیں شہد کی بڑی مکھیوں کا چھتہ ہے۔ میں نے چند مکھیوں کو ادھر جاتے دیکھا ہے۔" دادا بڑی نے شمال کی طرف نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

"مان گئے بھئی آپ کو۔" ملنگی نے اسے داد دی۔ "واقعی آپ کی نظر بہت تیز ہے!"

"تو جلدی چلو، کھڑے منہ کیا تک رہے ہو؟" چھوٹے والا شہد کھانے کے لیے کچھ زیادہ ہی بے تاب تھا۔

سب لوگ دادا بڑی کی رہنمائی میں اس طرف چل پڑے اور پھر جلد ہی ایک درخت کے نیچے پہنچ گئے، جس کی ایک موٹی سی ٹہنی پر واقعی ایک بڑا سا چھتہ موجود تھا اور چھتے میں شہد کی بے شمار بڑی مکھیاں موجود تھیں۔

چھوٹے والا اور مبارکاں کے منہ میں پانی بھر آیا:

"کم از کم تین، چار کلو شہد تو ہوگا؟"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔" دادا بڑی نے پُر خیال انداز میں کہا۔

"لیکن شہد وہاں سے کاٹ کر اُتاریں گے کیسے؟" گنجے والا فکر مند ہو گیا۔

"یہ کام تم ملنگی پر چھوڑ دو۔" ملنگی نے تسلی دی اور سب ہنس پڑے۔

دادا بڑی نے کہا: "اب سب لوگ ذرا اِدھر اُدھر سے گھاس پھونس اور جھاڑیاں جمع کریں۔"

"کیوں......؟ شہد کی مکھیوں کی چتا جلانی ہے کیا؟" چھوٹے والا نے حیران ہو کر کہا۔

"چتا تو میں تمہاری جلاؤں گا بیٹے...... ذرا اِدھر سے فارغ ہو لیں۔" دادا بڑی کو غصہ آ گیا۔ خیر، ہلکی پھلکی نوک جھونک چلتی رہی اور جھاڑیاں وغیرہ جمع ہو گئیں۔ اب ملنگی نے ان خشک جھاڑیوں پر چند گیلی جھاڑیاں بھی رکھیں اور آگ لگا دی۔ پھر خود ہی ان کی حکمت بیان کرتے ہوئے کہا: "جب ان گیلی جھاڑیوں کو آگ لگے گی تو دھواں پیدا ہوگا۔ جب یہ دھواں اوپر جائے گا تو شہد کی مکھیاں اندھی ہو کر اُڑ جائیں گی اور ہم مزے سے شہد اُتار لائیں گے۔"

"واہ جی! واہ......! یہ تو بڑا آسان طریقہ ہے۔" مبارکاں کے منہ سے نکلا۔

"اتنا آسان بھی......" ابھی دادا بڑی کی بات بھی پوری نہ ہوئی تھی کہ اچانک اس کے منہ سے نکلا: "ہائے!" ایک شہد کی مکھی نے اس کی گردن میں ڈنک اُتار دیا تھا اور یہ تو گویا بارش کا پہلا قطرہ تھا۔ دوسرے ہی لمحے لاتعداد شہد کی مکھیاں کھڑکھاند گروپ پر حملہ آور ہو چکی تھیں۔ دراصل مکھیوں نے بڑی ہوشیاری سے کام لیا تھا اور اس سے پہلے کہ دھواں انہیں اندھا کر دیتا، انہوں نے جوابی کارروائی شروع کر دی تھی۔ چند ہی لمحوں میں کھڑکھاند گروپ میں کھلبلی مچ چکی تھی اور ان کی فلک شگاف چیخوں سے پہاڑ گونج رہا تھا۔

ایسے میں اچانک ملنگی نے ہوش و حواس سے کام لیتے ہوئے چیخ کر کہا: "تالاب کی طرف بھاگو اور فوراً اس میں ڈبکی لگاؤ، ورنہ آج مارے گئے۔"

کھڑکھاند گروپ چیختا چلاتا سر پہ پاؤں رکھ کر تالاب کی طرف بھاگا اور پانی میں چھلانگیں لگا دیں لیکن اس وقت تک بلا مبالغہ ان کے جسم میں بیسیوں زہریلے ڈنک اُتر چکے تھے۔

پانی میں ڈبکی لگا کر کھڑکھاند گروپ نے سکون کا سانس لیا لیکن یہ سکون عارضی ثابت ہوا کیوں کہ جونہی کوئی سر باہر نکالتا، اوپر منڈلاتی ہوئی شہد کی مکھیاں اس کے سر پر حملہ کر دیتیں۔ گنجے والا تو بہت بُرا پھنسا تھا۔ اس کا گنجا سر "ڈرون حملوں" کا خاص نشانہ تھا۔

جب کھڑکھاند گروپ تالاب میں ڈبکیاں لگا لگا کر نیم جان ہو چکا تھا تو شہد کی مکھیوں نے ترس کھا کر ان کا پیچھا چھوڑ دیا۔ جیسے تیسے سب لوگ گھر پہنچے، خوب "موٹے تازے" ہو کر...... اور پھر کم از کم ایک ہفتہ تو کھڑکھاند گروپ کو گھر میں ہی گزارنا پڑا تھا۔ اس دوران گنجے والا کے خیالات میں ایک انقلابی تبدیلی آئی۔ اس نے تسلیم کر لیا کہ واقعی میں ہی غلط تھا، امریکہ نے ڈرون حملوں کا نام یقیناً انہی مکھیوں کے نام پر رکھا ہوگا۔

اس کے بعد کھڑکھاند گروپ پر ایک انوکھی مصیبت آئی۔ گئے تو تھے سیر کرنے، لیکن آخری دن ایک ماہر جیب کترے نے گنجے والا کی جیب کی صفائی کر دی۔ کھڑکھاند گروپ نے گنجے والا کا جو حشر نشر کیا، وہ تو ایک الگ بات ہے، فی الحال مسئلہ یہ تھا کہ ابھی کھانا بھی کھانا تھا اور واپسی کا کرایہ بھی جان نکال رہا تھا۔

اچانک ملنگی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور خوشی سے اُچھل پڑا۔

"لو جی کھڑکھاندیو! کام بن گیا...... دو ہزار روپے تو اِدھر میری جیب میں بھی پڑے ہیں، کرائے کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔"
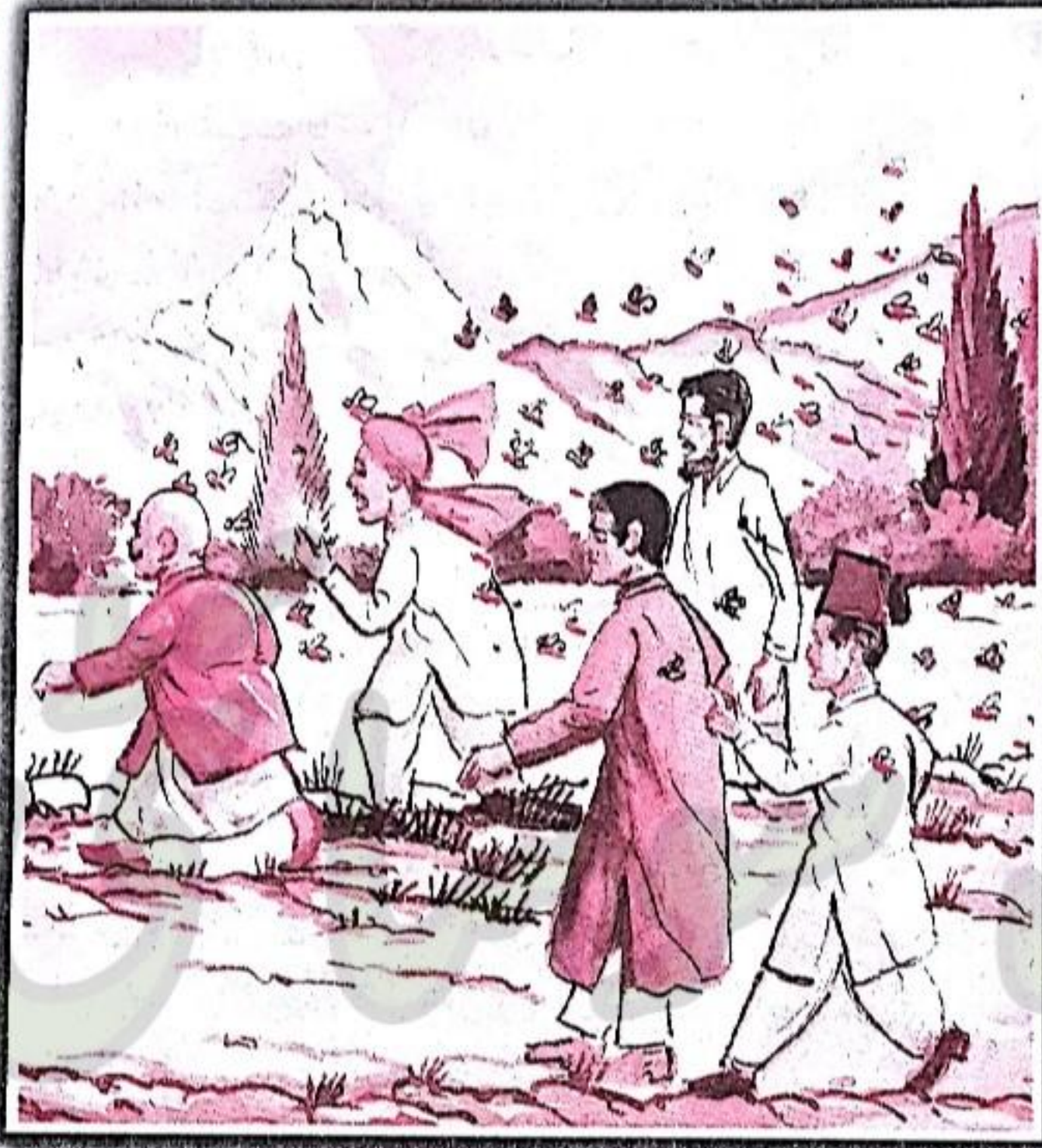
''لیکن کھانا کہاں سے کھائیں گے؟'' چھوٹے والا نے بے صبری سے کہا۔ ''اگر لاہور ہوتا تو داتا دربار چلے جاتے اور کوہاٹ میں زندہ پیر کا دربار زندہ باد...... لیکن فیصل آباد......؟ ایک منٹ......'' چھوٹے والا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''نور ولی شاہ اور بابا قائم سائیں یہاں کے مشہور ولی ہیں مگر وہاں گولڑہ شریف کی طرح باقاعدہ لنگر نہیں ہوتا۔ آ گیا تو مل گیا، ورنہ تَوَکَّلتُ عَلَی اللّٰہ......!''

درباروں کے بارے میں چھوٹے والا کا دس سالہ تجربہ کسی شک وشبہ سے بالاتر تھا اور اس کی معلومات کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''نہیں جی، پھر اُدھر جانا تو مناسب نہیں۔'' ملنگی نے صاف انکار کر دیا۔

''مبارکاں مبارکاں...... میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آ گیا۔'' اچانک مبارکاں نے چہک کر کہا۔

''اوہو! ہم تو آج تک یہی سمجھتے آئے تھے کہ تمہارے دماغ میں بھوسا بھرا ہوا ہے۔'' دادا بڈی نے حیران ہو کر کہا۔

مبارکاں کا منہ بن گیا۔ ''خدا کسی کو غریب بھی نہ کرے۔''

ایک زبردست قہقہہ پڑا۔ پھر گنجے والا نے کہا:

''تم ان کی پرواہ نہ کرو، اپنا آئیڈیا بتاؤ۔''

''آئیڈیا یہ ہے کہ......'' مبارکاں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''کوئی شادی والا گھر ڈھونڈتے ہیں، اندر گھس جائیں گے۔ کسی کو کیا پتا کہ یہ دولہا والوں کی طرف سے ہیں یا دلہن والوں کی طرف سے!''

''جی اوئے مبارکاں......'' ملنگی نے چہک کر کہا۔ ''کبھی کبھی بے کار دماغ میں بھی کام کی بات آ جاتی ہے۔''

اس سے پہلے کہ مبارکاں کوئی انتقامی کارروائی کرتا، کھڑکھاند گروپ کسی شادی کی تقریب کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا۔ اچانک دُور سے ایک گھر میں شامیانے لگے نظر آئے۔ جب کھڑکھاند گروپ قریب پہنچا تو کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو سے ان کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔

''کسی کی شادی ہے شاید...... آؤ ہم بھی گھس جائیں، اللہ کا نام لے کر!'' گنجے والا نے سرگوشی کی اور اگلے ہی لمحے سارا کھڑکھاند گروپ بڑے اعتماد سے چلتا ہوا اندر گھس گیا۔ کچھ دیر بعد وہ سب پلاؤ اور مرغ مسلّم پر ہاتھ صاف کر رہے تھے۔

''پلاؤ بہت مزے کا ہے۔'' چھوٹے والا نے دوسری پلیٹ اُٹھاتے ہوئے دادا بڈی سے سرگوشی کی۔

''ہماری تو مرغ سے خاندانی دشمنی ہے یار...... پہلے اس کا نام ونشان مٹا دیں، پھر پلاؤ کو بھی دیکھ لیں گے۔'' دادا بڈی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہاں موجود دوسرے لوگ انہیں عجیب نظروں سے گھورنے لگے۔ گنجے والا نے دادا بڈی کو ہلکی سی کہنی مارتے ہوئے کہا۔ ''چپ کر کے کھاؤ، مجھے حالات سازگار نہیں لگتے۔''

''ارے چھوڑو! ٹینشن نہ لو...... مرغ سے انصاف کرو۔'' ملنگی نے لاپرواہی سے کہا۔

گنجے والا نے کندھے اچکائے اور مرغ کا ایک پیس بھنبھوڑنے لگا۔

سارے کھڑکھاندی پلاؤ اور مرغ پر ہاتھ صاف کر رہے تھے جب اچانک پگڑی باندھے ہوئے ایک آدمی آہستہ آہستہ چلتا ہوا سیدھا کھڑکھاند گروپ کی طرف آیا۔ گنجے والا کے ذہن میں خطرے کا سائرن بجنے لگا۔ اس آدمی نے قریب آ کر کہا: ''جی میں نے آپ کو پہچانا نہیں، آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟''

گنجے والا کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کیا جواب دے کہ اچانک مبارکاں نے سارے کھڑکھاند گروپ کا مسئلہ حل کر دیا۔ وہ اچانک اُٹھا اور پگڑی والے سے ''مبارکاں مبارکاں'' کہتا ہوا بغل گیر ہو گیا۔ کھڑکھاند گروپ نے سکھ کا سانس لیا۔

پہلے تو پگڑی والا اس اچانک اُفتاد سے بوکھلا گیا، لیکن جلد ہی سنبھل کر کہا: ''کیا مطلب ہے آپ کا...... کس کی مبارک؟'' اس کے لہجے میں اچانک سختی آ گئی تھی۔

''وہ جی...... دراصل ہم...... لڑکی والوں کی طرف سے آئے ہیں۔'' مبارکاں نے شرمانے کی کامیاب ایکٹنگ کی تھی۔

''لڑکی والوں کی طرف سے...... کہنا کیا چاہتے ہیں آپ......؟ سیدھی طرح بات کرو!'' پگڑی والا نہ جانے کیوں غصے ہو گیا تھا۔

مبارکاں نے بوکھلا کر کہا۔ ''جی ہم تو...... ہم تو...... آپ کے بیٹے کی شادی میں آئے تھے۔'' اتنا کہہ کر مبارکاں نے پگڑی والے کا چہرہ غصے سے سرخ ہوتے دیکھا تو جلدی سے کہا۔ ''جی ہم...... لڑکی والوں کی طرف سے آئے ہیں۔''

پگڑی والے کا چہرہ غصے سے قندھاری انار کی طرح سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ ''کیا بکواس کر رہے ہو، میرے بیٹے کی شادی؟ یہ تو میرے ابا جی کا چہلم ہے۔'' غصے سے اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔

کھڑکھاند گروپ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ واقعی ان سے سنگین غلطی ہو گئی۔ اب کیا کریں......؟ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اچانک چھوٹے والا نے عقل مندی سے کام لیتے ہوئے کہا: ''بڑا افسوس ہوا جی آپ کے ابا جان کی وفات کا سن کر...... چلو کوئی گل نئیں جی...... اب اُن کی فاتحہ پڑھ لیتے ہیں۔''

''فاتحہ تو میں تمہارا پڑھواؤں گا بیٹے......'' پگڑی والے نے غصے سے چنگھاڑتے ہوئے کہا۔ ''اوئے گُلو...... شاکا...... بھولُو...... ادھر آؤ ذرا...... جلدی...... ان مفت خوروں کی ٹھکائی کرنی ہے۔''

فوراً ہی تین ہٹے کٹے آدمی بھاگتے ہوئے نمودار ہوئے۔ ایک آدمی نے دُور ہی سے چلّا کر کہا۔ ''کن بدبختوں کی ٹھکائی کرنی ہے ملک صاحب؟''

گنجے والا خطرے کو پہلے ہی بھانپ چکا تھا۔ پانی سر سے اُونچا دیکھتے ہوئے اس نے چلّا کر کہا۔ ''بھاگو کھڑکھاندیو! بھاگو......اب ہر کسی نے اپنی جان خود بچانی ہے۔''

اس سے پہلے کہ وہ ہٹے کٹے آدمی انہیں پکڑ کر ان کا قیمہ بنا ڈالتے، کھڑکھاند گروپ سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ انہوں نے کافی دُور تک پیچھا کیا تھا لیکن کھڑکھاند گروپ اس معاملے میں ایکسپرٹ کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ انہیں خالی ہاتھ ہی واپس جانا پڑا تھا اور کھڑکھاند گروپ نے تو اڈے پر پہنچ کر ہی دم لیا تھا۔

اس قصے کا سب سے افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ اڈے پر پہنچ کر اچانک کھڑکھاند گروپ پر یہ انکشاف ہوا کہ گنجے والا اپنی نئی ٹوپی اور ملنگی اپنے دادا کی اکلوتی نشانی (ایک عجیب وضع کا بوسیدہ کوٹ) وہیں چھوڑ آئے ہیں لیکن وہ اس بات پر خوش تھے کہ شکر ہے، جان بچ گئی۔ جان بچی، سو لاکھوں پائے! ☆☆☆

ادرک کے کرشمے

☆ مچھلی کھاتے ہوئے ادرک کا استعمال کیا جائے تو پیاس نہیں لگتی۔
☆ ادرک کا مربہ اور جائفل کو منہ میں رکھنا فالج سے نجات دیتا ہے۔
☆ ادرک دل کا فعل اور دورانِ خون درست کرتا ہے۔
☆ یہ خون کی نالیوں میں جمی چربی کی تہہ اُتارنے میں کام آتا ہے۔
☆ ادرک کو چبانے سے گلا صاف ہو جاتا ہے۔
☆ ادرک معدے کے امراض میں مفید ہے۔
☆ ادرک کا پانی پیشاب آور ہے۔ متورم جلد کا پانی نکال دیتا ہے۔ انتڑیوں کی سوزش بھی ختم کرتا ہے۔
☆ جن افراد کے منہ سے بدبو آتی ہو وہ ادرک کھائیں۔
☆ ہاضمہ درست رکھنے کے لیے کھانے کے بعد تازہ ادرک کا ٹکڑا چبا لیں۔ اس سے زبان کی میل بھی اُترتی ہے۔
☆ ادرک کی چائے سردی، زکام اور بخار میں مفید ہے۔
☆ ادرک کا استعمال یادداشت بڑھاتا ہے۔
☆ کمر اور جوڑوں کے درد میں مفید ہے۔

......☆......

رانا محمد شاہد
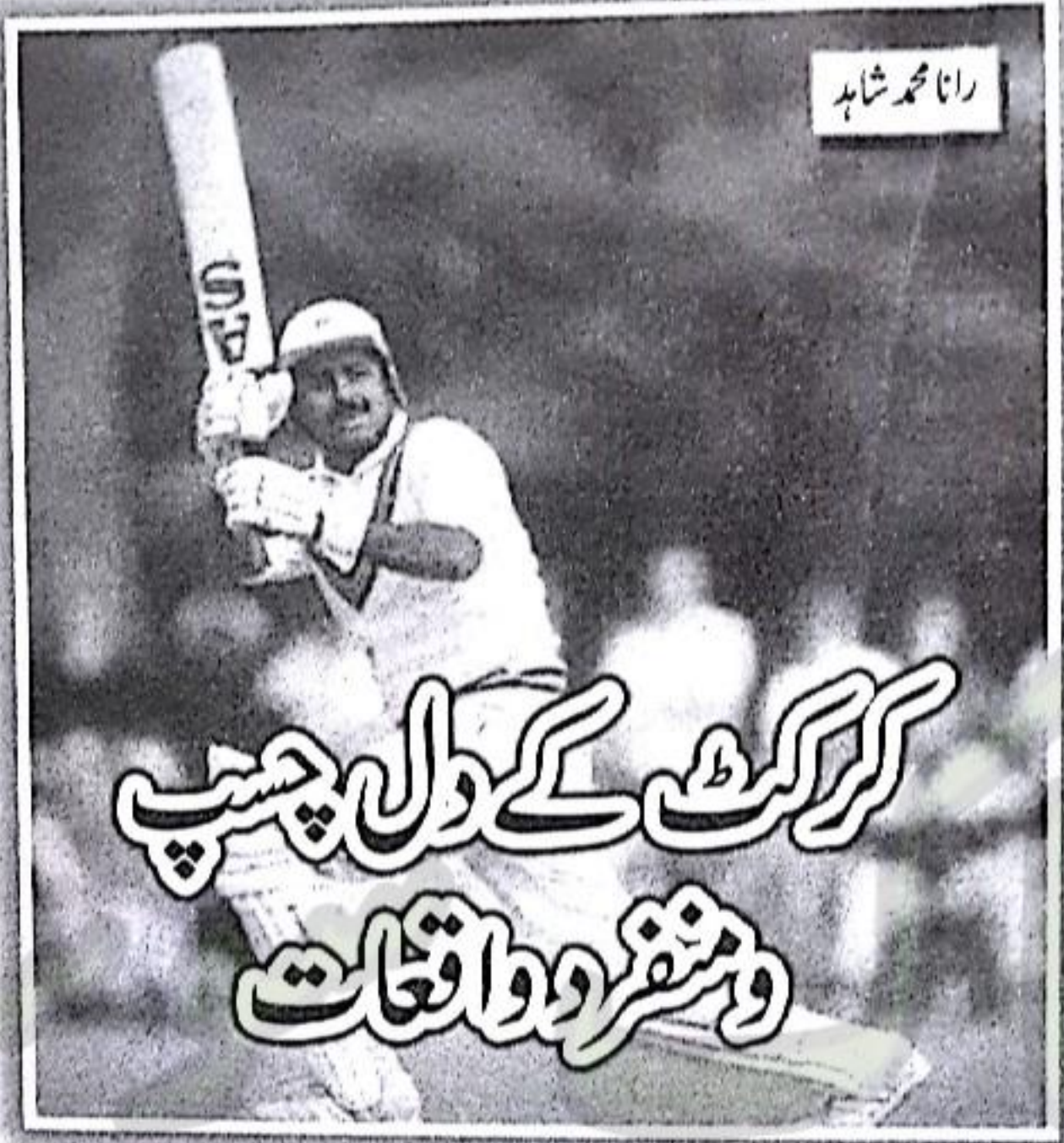
کرکٹ کے دل چسپ و منفرد واقعات

کرکٹ..... دُنیا کے دل چسپ تیز ترین کھیلوں میں سے ایک ہے۔ یہ ان ممالک میں بھی شوق سے دیکھا جاتا ہے جن کی کرکٹ ٹیمیں نہیں ہیں۔ پاکستان میں کرکٹ کا کھیل ایک جنون کی صورت رکھتا ہے۔ جذبات، جنون و جوش اس کھیل کی خوب صورتی ہیں۔ انہی جذبات و جنون میں بہت سے دل چسپ واقعات و حادثات بھی پیش آتے ہیں۔ اس مضمون میں چند دل چسپ و منفرد واقعات پیش کر رہے ہیں۔

اونچا اور منفرد شارٹ

یہ کرکٹ کے ابتدائی دنوں کی بات ہے۔ آسٹریلیا کی ٹیم کا ایک کھلاڑی جارج جان بالز تھا۔ اس بلے باز کا قد 6 فٹ 6 انچ اور وزن تقریباً 102 کلوگرام تھا۔ اسے عام طور پر آسٹریلوی ہرکولیس کہا جاتا تھا۔ جارج بالز زوردار ہٹیں لگانے کا ماہر تھا۔ اس نے آسٹریلوی ٹیم کے ساتھ انگلینڈ کے 5 دورے کیے اور کل 17 ٹیسٹ میچ کھیلے۔ 1880ء میں جب انگلینڈ کی سرزمین پر پہلا ٹیسٹ اوول کے میدان میں کھیلا گیا تو جارج نے ایک اُونچی ہٹ لگائی اور ایسی اُونچی کہ گیند کے نیچے آنے تک وہ اپنے ساتھی کے ہمراہ 2 رنز مکمل کر کے تیسرے رن کے لیے مڑا ہی تھا کہ کیچ آؤٹ ہوگیا۔ بالز اپنی ٹیم کے لیے پہلی اننگز میں صرف 2 رن ہی بنا سکا تھا۔ یہ ٹیسٹ کرکٹ کی منفرد شاٹ تھی کہ جس کے نیچے آتے آتے رنز بن چکے تھے۔

میانداد کا تاریخی چھکا، کانٹے دار مقابلہ

دُنیائے کرکٹ میں جاوید میانداد کے اس چھکے کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا جو انہوں نے شارجہ میں آخری گیند پر چیتن شرما کو مارا تھا۔ یوں یہ میچ پاکستان جیت گیا تھا۔ یہ ایک بہت ہی سنسنی خیز میچ تھا۔ 1986ء میں آسٹریلشیا کپ کے لیے دونوں ٹیمیں شارجہ کے میدان میں اُتریں تو اسٹیڈیم پاکستانی اور بھارتی شائقین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ آخری گیند پر پاکستان کو جیتنے کے لیے چار رنز درکار تھے۔ بھارتی کپتان نے فیلڈ باؤنڈری لائن پر سیٹ کر دی اور حکم جاری کر دیا کہ کچھ بھی ہو جائے چار رنز نہیں ہونے دینے۔ ان کی حکمت عملی تھی کہ اگر تین رنز بھی بن گئے تو ایک رن کی مدد سے میچ جیتا جا سکتا ہے۔ کریز پر جاوید میانداد تھے اور باؤلنگ اینڈ پر چیتن شرما تھے۔ شرما اس سے قبل ورلڈ کپ کے ایک میچ میں ہیٹ ٹرک کر کے عالمگیر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ چیتن شرما کو شاید یقین تھا کہ وہ آسانی سے بھارت کو یہ میچ جیتوا دیں گے لیکن پاکستانی لیجنڈ جاوید میانداد تو کچھ اور ہی سوچے بیٹھے تھے۔ اگلے ہی لمحے گیند فیلڈرز کے سروں کے اُوپر سے گزرتی ہوئی باؤنڈری لائن کراس کر گئی اور پاکستان میچ جیت گیا۔

کورٹنی والش کا سپورٹس مین سپرٹ

1987ء کا ورلڈ کپ تھا۔ پاکستان اور ویسٹ انڈیز کے درمیان سنسنی خیز میچ آخری مراحل میں تھا۔ ویسٹ انڈیز کے فاسٹ باؤلر کورٹنی والش کو پاکستانی کھلاڑی سلیم جعفر کو رن آؤٹ کرنے کا ایک سنہری موقع ملا۔ والش نے اس موقع سے فائدہ بھی اُٹھایا لیکن سلیم جعفر اس سے تیز نکلے، پھرتی کے ساتھ کریز پر پہنچ کر انہوں نے والش کے ارادے کو ناکام بنا دیا۔ صورتِ حال عجیب مرحلے میں داخل ہوگئی۔ بظاہر لگ رہا تھا کہ سلیم جعفر رن آؤٹ ہو چکے ہیں اور قریب تھا کہ امپائر انہیں رن آؤٹ قرار دے کر پویلین کی راہ دکھا دیں کہ کورٹنی والش امپائر کے پاس پہنچ گئے اور انہیں یہ بتا کر حیران کر دیا کہ سلیم جعفر کریز میں پہنچ گئے تھے۔ کورٹنی والش کی اس فیئر گیم کے صلے میں انہیں اسپیشل پرائز دیا گیا لیکن ویسٹ انڈیز

ورلڈ کپ سے باہر ہوگیا۔

حیرت انگیز واقعہ...... عظیم بلے باز

آسٹریلیا کے بلے باز وکٹر ٹرمپر اپنے کھیل میں منفرد تکنیک کی وجہ سے پوری دُنیا میں مشہور تھے۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ''کرکٹ میں کوئی دوسرا وکٹر ٹرمپر پیدا نہیں ہوسکتا۔'' اس کرکٹر کی سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وکٹر ٹرمپر نے دُنیا میں 38 سال فاقہ مستی میں گزارے۔ کرکٹ کی دُنیا کا یہ کامیاب بلے باز ایک ناکام تاجر تھا۔ وکٹر سڈنی میں کھیلوں کا سامان بنانے والی کمپنی کے مالک تھے لیکن وہ سامان کی فروخت سے زیادہ تحفے تحائف دینے میں دل چسپی رکھتے تھے۔ اسی لیے دکان کم ہی چلتی تھی۔ ایک دن صبح وہ اپنی دکان میں کام کر رہے تھے۔ ٹیسٹ شروع ہونے میں کچھ وقت رہ گیا تھا۔ انہوں نے اپنا کوٹ سنبھالا، الماری سے ایک نیا بلا نکالا اور ٹیکسی پکڑ کر فوراً سڈنی کرکٹ گراؤنڈ میں پہنچ گئے۔ اس دن انہوں نے نئے بلے سے آؤٹ ہوئے بغیر 185 رنز بنائے۔ ان کی اس اننگز کو لازوال کہا جاتا ہے۔ اس دن کے کھیل کے اختتام پر وہ دوبارہ اپنی دکان پر آ گئے۔ کچھ دیر بعد ان کا ایک دلدادہ بھی دکان میں داخل ہوا اور ان سے پوچھا۔ ''میں آپ کا وہ بلا خریدنا چاہتا ہوں جس سے آپ نے آج سنچری بنائی تھی۔'' وکٹر ٹرمپر نے نہایت دل چسپ جواب دیا۔ ''جی ہاں! وہ بلا موجود ہے۔ آج میرے استعمال کرنے سے پہلے اس کی قیمت 45 ڈالر تھی لیکن اب وہ پُرانا ہوگیا ہے، اس لیے وہ آپ کو صرف ایک ڈالر میں مل جائے گا۔'' وکٹر ٹرمپر کا وہ معتقد ان کی قلندری پر حیران رہ گیا۔

18 بالز کا اوور

یہ حیرت انگیز مگر ناپسندیدہ ریکارڈ پاکستان کے فاسٹ باؤلر محمد سمیع نے بنگلہ دیش کے خلاف ایک ون ڈے میچ کے دوران حاصل کیا۔ محمد سمیع اس وقت کیریئر کی بدترین فارم میں تھے یعنی نو بالز اور وائیڈ بالز کثرت سے کرایا کرتے تھے لیکن اس ایک اوور میں تو حد ہی ہوگئی اور چھ لیگل بالز کرانے کے دوران بارہ ایکسٹرا بالز بھی نو بال یا وائیڈ بال کی شکل میں کرا دیں۔ انٹرنیشنل کرکٹ میں اتنے طویل اوور کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

ٹیسٹ میں آسٹریلیا کی طرف سے پہلی سنچری

ٹیسٹ کرکٹ میں پہلی سنچری کے لیے آسٹریلیا کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس کے کھلاڑی چارلس بیز مین نے پہلے ہی میچ میں یہ سنچری بنا لی تھی۔ چارلس بیز مین انگلینڈ میں پیدا ہوا لیکن کرکٹ آسٹریلیا کی طرف سے کھیلی۔ وہ اس اسکواڈ کا حصہ تھا جس نے 77-1876ء میں میلبورن میں افتتاحی ٹیسٹ میچ کھیلا۔ چارلس نے اسی میچ میں 165 رنز کی اننگز کھیلی جب کہ اس کی پوری ٹیم 245 رنز بنا کر پویلین لوٹ گئی تھی۔ چارلس کے 165 رنز کل سکور کا 67.3 فی صد تھا جو ایک ٹیسٹ ریکارڈ بنا۔

انضمام الحق کا متنازعہ ترین آؤٹ

فیصل آباد میں کھیلے گئے ایک میچ میں انوکھا واقعہ پیش آیا۔ انضمام الحق نے گیند باؤلر اسٹیو ہارمیسن کی جانب کھیلا۔ انہوں نے فوری طور پر گیند کو پکڑ کر واپس تھرو کیا۔ انضمام جو اس وقت کریز سے باہر تھے، گیند کی زد میں آنے سے بچنے کے لیے پیچھے ہٹے اور گیند سیدھی وکٹوں پر جا لگی، اپیل کی گئی۔ متنازعہ امپائر ڈیرل ہیئر نے تھرڈ امپائر ندیم غوری کے مشورے سے انہیں آؤٹ قرار دے دیا جو کرکٹ قوانین کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔

سست ترین بیٹنگ کا حیران کن ریکارڈ

سست ترین بیٹنگ کے لیے بہت سے بلے بازوں کے نام آتے ہیں مگر بھارت کے سابق کپتان سنیل گواسکر کو سست بیٹنگ میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ سنیل گواسکر اکثر اوقات اس قدر احتیاط سے کھیلتے کہ شائقین کرکٹ بور ہو جاتے اور اسٹیڈیم سے اُٹھ کر چلے جاتے یا ان کی توجہ کھیل سے مکمل طور پر ہٹ جاتی۔ ان کی سست رفتار بلے بازی کا حیرت انگیز واقعہ پہلے کرکٹ ورلڈ کپ کا ہے۔ یہ میچ انگلینڈ کے خلاف تھا۔ انگلینڈ کی ٹیم نے پہلے بیٹنگ کرتے ہوئے 334 رنز کیے۔ اس وقت ون ڈے میچز 60 اوورز پر مشتمل ہوتے تھے۔ اب 60 اوورز میں بھارت کو جیتنے کے لیے 335 رنز کا ہدف حاصل کرنا تھا۔ اس وقت کرکٹ قوانین تو تھے لیکن شاید گواسکر یہ نہ سمجھے۔ ان کے خیال میں اگر ان کی پوری ٹیم 60 اوورز میں آؤٹ نہ ہوئی تو میچ ڈرا ہو جائے گا۔ غالباً ون ڈے کرکٹ قوانین سے آگاہی نہ ہونے کے باعث انہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔ اس غلط فہمی کی وجہ سے وہ دفاعی کھیل کھیلتے رہے کیوں کہ جب 60 اوورز پورے ہوئے تو وہ 36 رنز پر ناٹ آؤٹ تھے۔ اپنی اس سست ترین اننگز میں انہوں نے 174 گیندوں کا سامنا کیا۔ ان کے اسکور میں صرف ایک چوکا شامل تھا جب کہ مجموعی طور پر ان 60 اوورز میں بھارت کے 132 پر تین کھلاڑی آؤٹ ہوئے تھے۔

میری زندگی کے مقاصد

عثمان منور، کراچی

میں فوجی بن کر وطن کی حفاظت کروں گا۔

ثمن آفتاب، اسلام آباد

میں بڑی ہو کر فٹ بال کے کھیل میں اپنا مقام بناؤں گی۔

زوہیب مصطفیٰ، جوہر آباد

میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔

عثمان نعیم، کراچی

میں قائداعظم جیسی سوچ رکھنے والا انسان بنوں گا۔

صفی الرحمان، لاہور

میں بڑا ہو کر انجینئر بنوں گا۔

عقیلہ رباب، تلہ گنگ

میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کا نام روشن کروں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

عبدالرحیم خان، راجہ جنگ

میں فوجی بن کر اپنے ملک کی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔

عبدالہادی، اسلام آباد

میں اچھا انسان بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کروں گا۔

ام کلثوم، سیال کوٹ

میں بڑی ہو کر ٹیچر بنوں گی اور لوگوں کے کام آؤں گی۔

ابوالحسن مبشر، بھلوال

میں بڑا ہو کر مبلغ اسلام بن کر دین کی خدمت کروں گا۔

محمد شوال ندیم، اوکاڑہ

میں عالم دین بن کر دینِ اسلام کی خدمت کروں گا۔

محمد باسط، کراچی

میں حافظِ قرآن بن کر دینِ اسلام کی خدمت کروں گا۔

عمر جمال اعوان، ساہی وال

میں فلائنگ فائٹر بن کر ملک کی فضائی حدود کی حفاظت کروں گا۔

حفیظ اللہ، وہوا

میں ڈاکٹر بن کر اپنے والدین کا نام روشن کروں گا۔

ربیشا نور، اسلام آباد

میں ڈاکٹر بن کر اپنے وطن کا نام روشن کروں گی۔

طلحہ عرفان، کراچی

میں فوجی بن کر ملکی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔

ایمن کائنات، ڈی جی خان

میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔

ابرار نیاز، کراچی

میں حافظِ قرآن بن کر دینِ اسلام کی خدمت کروں گا۔

عشاء نور، سیال کوٹ

میں آرمی آفیسر بن کر ملک کی حفاظت کروں گی۔

مختصر مختصر

نماز

پانچ وقت پڑھو تم دن میں نماز
فجر سے کرو تم دن کا آغاز
دوپہر میں بھی تم مسجد کو بڑھو
اور ظہر کی نماز یاد سے پڑھو
عصر کو بھی مت جدا کرو
سورج ڈھلنے سے پہلے ادا کرو
تھوڑا وقت ہے مغرب کا، اس لیے دوڑو
باقی سب کاموں کو ابھی تم چھوڑو
سکون کی نیند کے لیے بس یہ کرنا
یاد سے عشاء کی نماز ادا کرنا
طوبیٰ تم بھی نمازیں پڑھو
اور اللہ کو تم بھی راضی کرو

(کاوش: طوبیٰ وحید، ہری پور)

شکر

ایک شخص اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ رہا تھا کہ ''اے اللہ! مجھے صبر عطا فرما۔'' حضور اکرمؐ نے یہ دعا سنی تو فرمایا: ''تو خدا سے صبر نہ مانگ کیوں کہ صبر مصیبت پر کیا جاتا ہے۔ پہلے مصیبت آئے گی، پھر صبر کی توفیق اللہ عطا فرمائے گا۔ اللہ سے شکر ادا کرنے کی توفیق مانگ کیوں کہ اگر تو شکر ادا کرنے کی توفیق مانگے گا تو پہلے نعمت ملے گی، پھر شکر ادا کرنے کی توفیق اللہ عطا فرمائے گا۔''

ناخن

جب ناخن بڑے ہو جاتے ہیں تو ناخن ہی کاٹے جاتے ہیں، انگلیاں نہیں۔ ایسے ہی جب رشتے داروں میں غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں تو غلط فہمیوں کو ختم کرنا چاہیے، رشتوں کو نہیں۔ (نرل سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

تتلی

بچوں سے ہے مجھے پیار بہت
پر پکڑتے ہیں وہ مجھے بہت
ان کو اچھی لگتی ہوں میں بہت
میں پسند بھی کرتی ہوں ان کو بہت
میرے پیارے پھولوں کو توڑتے ہیں بہت
مجھے اس بات پر دکھ ہوتا ہے بہت
میرا تو دل دکھاتے ہیں بہت
پر میں غصہ نہیں کرتی بہت
نسل ہے میری کم بہت
بچوں کو پسند ہوں میں بہت

(کاوش: کشف جاوید، فیصل آباد)

محبت ہو تو ایسی ہو

اورنگ زیب عالم گیر نے اپنے نوکر محمد خان کو صرف خان کہہ کر بلایا تو وہ وضو کا پانی لے کر آگے بڑھا۔ پاس کھڑے کسی شخص نے پوچھا: ''تمھیں کیسے پتا چلا کہ بادشاہ سلامت نے وضو کے لیے پانی منگوایا ہے؟'' نوکر نے جواب دیا۔ ''بادشاہ سلامت کی عادت ہے کہ وہ میرا پورا نام بغیر وضو کے نہیں پکارتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے نام کا آغاز لفظ محمد سے ہوتا ہے۔ جب وہ مجھے خان کہہ کر پکارتے ہیں تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ انھیں وضو کے لیے پانی چاہیے۔'' یہ سن کر سوال کرنے والے کی زبان سے نکلا۔ ''سبحان اللہ! محبت ہو تو ایسی ہو......''

(حافظہ مہدیہ آصف، گوجرانوالہ)

محنت

محنت ہی وہ چیز ہے جو انسان کو اعلیٰ سے اعلیٰ مقام تک پہنچا سکتی ہے۔ یہ محنت ہی تھی کہ جس نے بچپن میں جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر اپنا پیٹ بھرنے والے جان ابراہم کو امریکہ میں صدر کے عہدے تک پہنچایا۔ محنت سے انسان ناممکنات کو ممکنات میں بدل سکتا ہے۔ ہمارا دین بھی ہمیں محنت کرنے کا درس دیتا ہے کیوں کہ محنت ایک ایسی چیز ہے جو کہ کبھی بھی رائیگاں نہیں جاتی۔ محنت نے ہی ایک ضدی مزدور اور ناکام مصور کو ہٹلر کے نام سے شہرت بخشی۔ محنت ہی سے بچپن میں ریلوے اسٹیشنوں پر پھٹے حالوں میں چائے چائے کی آوازیں لگانے والا آگے چل کر انڈیا کا وزیر اعظم بنا اور دنیا نے اسے نریندر مودی کے نام سے جانا۔ اسی لیے تو ایک شاعر نے کہا ہے کہ:

بن محنت کچھ ہاتھ نہ آئے ہاتھ آئے ناداری
محنت ایسا جادو ہے جس سے ریت بنے پھلواری

(مریم صدیقہ راجپوت، گوجرانوالہ)

اقوالِ حضرت علیؓ

☆ اپنے بہترین وقت کو نماز میں وقف کرو کیوں کہ تمہارے سب کام تمہاری نماز کے بعد قبول ہوں گے۔

☆ جس دن تمہارا عزیز دوست تم کو چھوڑ کر چلا جائے تو سمجھ لینا کہ تمہاری آدھی زندگی کم ہوگئی۔

☆ انسان کی غلطیاں اسے وہ درس دیتی ہیں جو اسے کسی درس گاہ

سے نہیں مل سکتا۔

☆ علم کی وجہ سے دوستوں میں اضافہ ہوتا ہے اور دولت کی وجہ سے دشمنوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

(عدن سجاد، جھنگ صدر)

سنہری باتیں

☆ احسان کا بدلہ اتارنے کی طاقت نہ ہو تو زبان سے شکریہ ضرور ادا کرو۔
☆ نیکی پر غرور کرنا نیکی کے اجر کو ضائع کر دیتا ہے۔
☆ گناہ پر پشیمان اور شرمندہ ہونا گناہ کو مٹا دیتا ہے۔
☆ رنج کے بغیر راحت اور غم کے بغیر خوشی کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔
☆ غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھو۔ (ایمن اعجاز، باڑہ ہملٹ)

اقوال زریں

☆ دو دفعہ دریافت کرنا ایک دفعہ غلطی کرنے سے بہتر ہے۔
☆ تمہاری جیب روپے سے خالی ہو تو کوئی بات نہیں مگر دل ولولہ سے لبریز ہونا چاہیے۔
☆ عالم سے ایک گھنٹا کی گفتگو برس کے مطالعہ سے بہتر ہے۔
☆ سب سے اچھا فاصلہ گھر سے مسجد تک کا ہے۔
☆ کانچ کا دل لے کر پتھر کی اس دُنیا میں جینا مشکل ہے۔
☆ اچھا کام شروع کرنا انسان کا کام ہے، تکمیل کرنا خدا کا کام ہے۔
☆ کتنے شرم کی بات ہے کہ صبح ہمارے جاگنے سے پہلے پرندے جاگ جائیں۔ (علیہ احمد، راولپنڈی)

رسولِ اکرم ﷺ کا ارشادِ پاک

☆ میں صرف نیک اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔
☆ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔
☆ کامل ایمان اس مومن کا ہے جس کا اخلاق اچھا ہے۔
☆ آخرت کی زندگی میں میرے قریب وہ شخص ہوگا جو تم میں سب سے خوش اخلاق ہوگا۔
☆ انسان حسنِ اخلاق سے وہ درجہ حاصل کر لیتا ہے، جو مسلسل روزے رکھنے اور مسلسل عبادت سے حاصل ہوتا ہے۔
☆ ان کو قدرت کی طرف سے جو چیز عطا کی گئی، ان میں سب سے بہتر اخلاق ہے۔
☆ روزِ قیامت اعمال کے ترازو میں حسنِ اخلاق سے بڑھ کر کوئی

شے نہ ہوگی۔ (فاطمہ ضیاء، گجرات)

اقوال زریں

☆ کم بولنا عقل مندی ہے۔
☆ توبہ کرنا آسان اور گناہ چھوڑنا مشکل ہے۔
☆ کسی کا بُرا چاہنے والا کبھی خوش نہیں ہو سکتا۔
☆ غرور سے آدمی کا دین ضائع ہو جاتا ہے۔
☆ علم ایک ایسا بادل ہے جس سے رحمت برستی ہے۔
☆ ہر حالت میں انصاف کرو۔
☆ مایوسی موت کا دوسرا نام ہے۔
☆ مسکراہٹ روح کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ (ایم مامون مروت، لکی مروت)

چڑیا کی پکار

ننھے منے پیارے بچو
چڑیا کی پکار سنو
چوں چوں کر کے کیا کہتی ہے
غصے سے یہ کیوں تکتی ہے
پکڑنے کی کوشش ہیں کرتے
ستاتے رہتے ہیں ہمیں بچے
جب بھی بنائیں گھونسلے اپنے
خراب ہمارے گھر ہیں کرتے
ہمارے بچوں کو یہ چھیڑیں
ہمارے انڈوں کو یہ توڑیں
مر جائیں گے یہ بے چارے
نازک بہت ہیں بچے ہمارے
غور سے میری بات سنو
ننھے منے پیارے بچو
ان کو مت تم دکھی بناؤ
کبھی پرندوں کو نہ ستاؤ
تنگ ہمیں ننھے بچے کرتے
شکوہ کریں گے اللہ میاں سے
کرو وہی کہے مولا جو......
خفا کرو نہ تم اللہ کو

☆

ماں

آسمان نے کہا، میرا قدرتی تحفہ ماں ہے۔ چاند نے کہا، ماں ٹھنڈک ہے۔ سورج نے کہا، ماں کی گود کی گرمائش مجھ میں نہیں۔ اولاد نے کہا، اگر دُنیا میں جنت ہے تو ماں کے قدموں تلے ہے۔ شاعر نے کہا، ماں اک غزل ہے۔ سمندر نے کہا، ماں اک کنارہ ہے۔ پھول نے کہا، ماں اک خوشبو ہے۔ استاد نے کہا، ماں کھلی کتاب ہے۔ موسم نے کہا، ماں بہار کی پہلی صبح ہے۔ بادل نے کہا، ماں ساون کے پہلے قطرے کی مانند ہے۔ (کاوش: اریج عزیز الرحمٰن)

☆☆☆

ری فلیزیا آرنلڈ آئی

ری فلیزیا آرنلڈ آئی (Rafflesia Arnoldii) دُنیا کا سب سے بڑا پھول پیدا کرنے والا پودا ہے جس کا تعلق
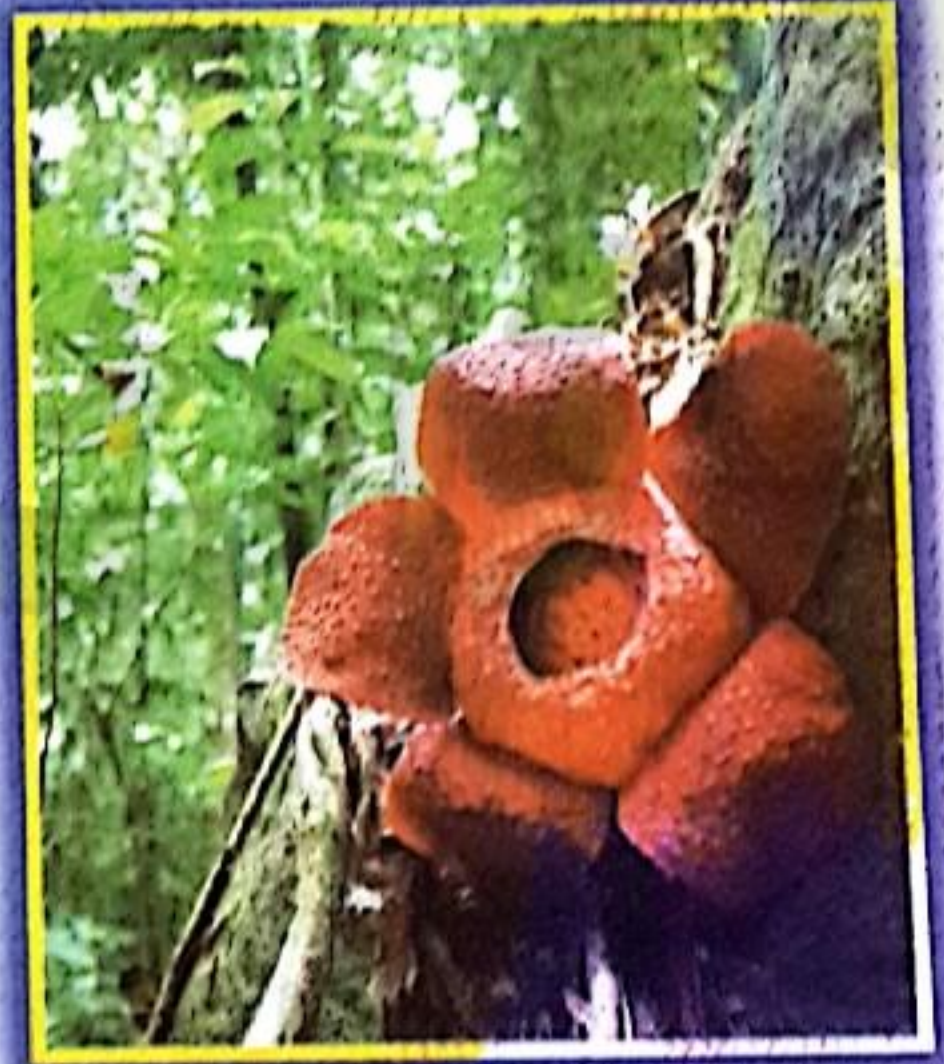
"Rafflesiaceae" خاندان سے ہے۔ اس پھول سے گوشت کے سڑنے والی بدبو کی طرح بھبکے اُٹھتے ہیں۔ اسی لیے اسے "Carrion Flower" بھی کہا جاتا ہے یعنی بدبودار پھول۔ ری فلیزیا کی لگ بھگ 28 اقسام ہیں۔ یہ کثیر بارشوں والے جنگلات بورنیو اور سماٹرا میں پایا جاتا ہے۔ یہ انڈونیشیا کا قومی پھول ہے۔ اس کو سب سے پہلے لوئیس آگسٹی نامی سائنس دان نے بیان کیا جو فرانسیسی تھا۔ 1821ء میں باضابطہ طور پر اس پھول کی دریافت کا اعلان کیا جس کا ڈایا میٹر ایک میٹر (3 فٹ) اور وزن 11 کلوگرام تک ہوتا ہے۔ یہ طفیلی (Parasite) پودا ہے۔ جو ٹیٹرا اسٹگما (Tetra stigma) بیل پر اُگتا ہے۔ اس پودے میں پتے، تنا وغیرہ نہیں ہوتے۔ یہ فنگس کی طرح ریشوں پر اُگتا ہے اور Host سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ پھول کا رنگ کلیجی کی طرح سرخی مائل ہوتا ہے۔ یہ بہت نایاب پودا ہے جسے بچانے کے لیے تحقیقات جاری ہیں۔

ڈولفن

ڈولفن (Dolphin) ایک دودھ پلانے والا جانور ہے جسے لوگ شکل و شباہت کے باعث مچھلی سمجھتے ہیں۔ ڈولفن کا آرڈر "Cetacea" اور کلاس ممالیہ ہے۔ ڈولفن کی 17 اقسام ہیں۔ ان کا سائز 1.2 میٹر (4 فٹ) اور وزن 40 کلو (90 پاؤنڈ) تک ہوتا ہے۔ تاہم MAUI ڈولفن کی لمبائی 30 فٹ اور وزن 10 ٹن ہوتا ہے۔ ان کے جسم پر چھوٹے بال ہوتے ہیں۔ یہ ذہین

مخلوق ہے۔ انسان سے دوستی بھی کرنے والا جانور ہے۔ یہ جانور مل جل کر رہتے ہیں۔ جھنڈ کی صورت میں سمندر میں رہتی ہیں۔ یہ سیٹیاں بجا کر ایک دوسرے سے رابطہ رکھتی ہیں۔ ان کی نسل کو انسانوں اور شارک مچھلی سے خطرات کا سامنا ہے۔ رومانیہ، انگولا اور فرانسیسی بحری فوج اپنی وردی پر ڈولفن کا نشان استعمال کرتی ہے۔

یونانی اسے خوش بختی کی علامت سمجھتے ہیں۔ ہندو مذہب بھی اس کا احترام کرتا ہے جب کہ جاپان اور پیرو کے لوگ ڈولفن کھاتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام

پاکستان کے پہلے نوبل ایوارڈ یافتہ سائنس دان ڈاکٹر عبدالسلام، 29 جنوری 1926ء کو جھنگ میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر عبدالسلام کے والد کا نام چوہدری محمد حسین جب کہ والدہ کا نام ہاجراں تھا۔ اُردو اور انگریزی ادب میں بڑی دل چسپی تھی لیکن سائنس اور خاص کر فزکس میں نام کمایا۔ آپ پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور (جی سی یونیورسٹی) کے طالب علم رہے۔ 1954ء تک آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں ریاضی (Maths) کا مضمون پڑھایا۔ فزکس کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالسلام نے مادے کے ذرات "Neutrino" پر کام کیا۔ یہ مادے کا ذرّہ ہے جس پر کوئی چارج نہیں ہوتا۔ بعدازاں فزکس اور ریاضی کے متعدد تحقیقی
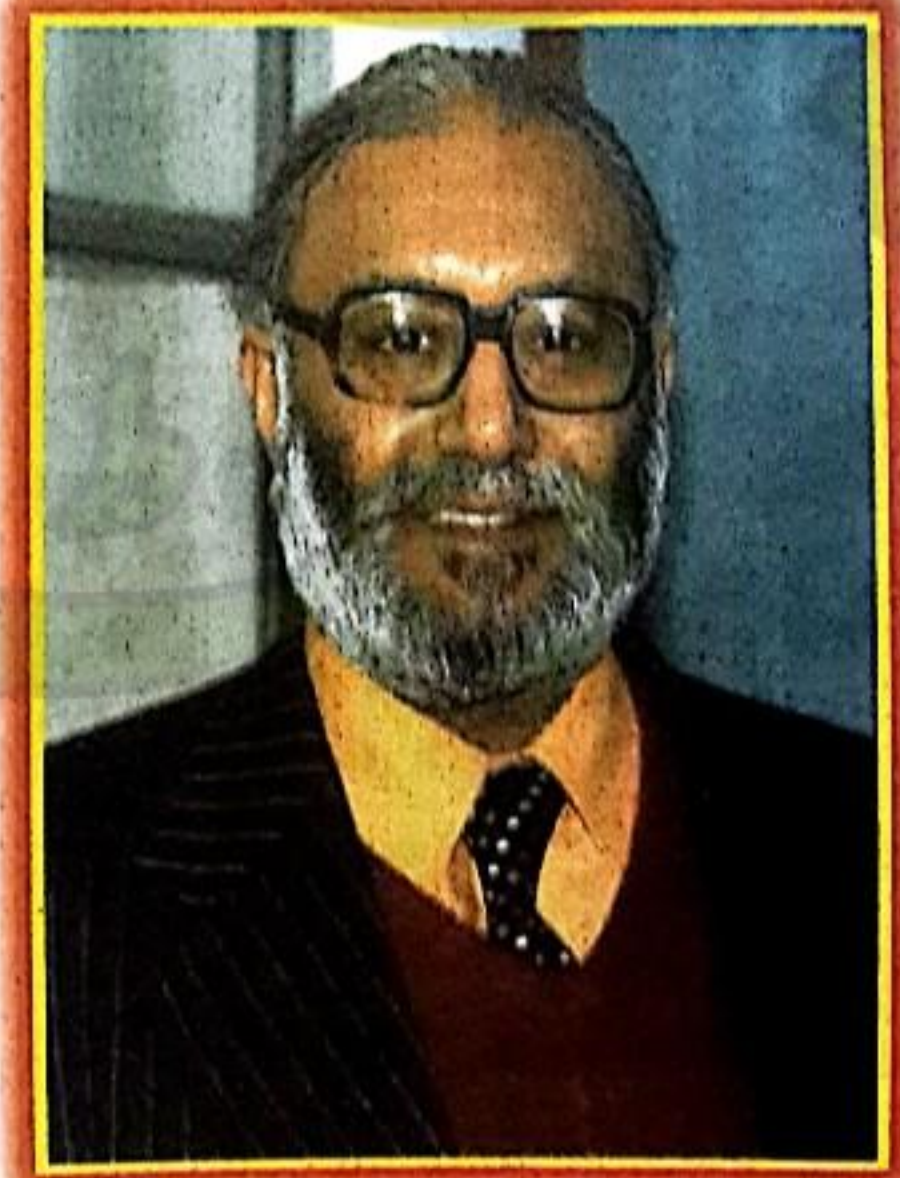
کارنامے سرانجام دیئے۔ ڈاکٹر عبدالسلام، Glashow اور Weinberg، ان تینوں سائنس دانوں کو 1979ء میں نوبل ایوارڈ عطا کیا گیا۔ اس ٹیم نے الیکٹرو ویک یونی فیکیشن تھیوری (Electro Weak Unification) کا ریاضیاتی ماڈل پیش کیا تھا۔ آپ اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے جن میں پُرامن ایٹمی پروگرام اور پاکستان کا خلائی پروگرام بھی شامل ہے۔ آپ نے بیرونِ ملک بھی خدمات سرانجام دیں۔ آپ نے دو شادیاں کیں۔ ان میں سے ایک بیوی "Louise" بایوفزکس کی پروفیسر تھی۔ آپ 21 نومبر 1996ء کو 70 برس کی عمر میں انگلینڈ میں فوت ہوئے۔ محکمۂ ڈاک نے آپ کے اعزاز میں ڈاک ٹکٹ بھی شائع کیا۔

انفلوائنزا

انفلوائنزا (Influenza) کو عموماً فلو "Flu" بھی کہا جاتا

ہے۔ یہ موسم سرما میں عام بیماری ہے جس کا ذمہ دار وائرس ہے۔ اس بیماری میں جسم سردی محسوس کرتا ہے۔ بخار، ناک بہنا، گلے کی خرابی، پٹھوں میں دکھن، سر درد، کھانسی، کمزوری اور ناک میں جلن اس کی علامات ہیں۔ انفلوائنزا وائرس کا خاندان "Orthomyxoviridae" ہے۔ اس وائرس کے چھ Genera ہیں۔ انفلوائنزا وائرس پرندوں، مچھلیوں، بندروں، بکریوں حتیٰ کہ مچھروں کو بھی بیمار کر دیتا ہے۔ کتے اور سؤر بھی ان سے نہیں بچ پاتے۔ وائرس میں RNA ہوتا ہے جس کے گرد پروٹین کا خول ہوتا ہے۔ وائرس کا سائز 50 سے 120 نینو میٹر (Nano meter) ہوتا ہے۔ ایک نینو میٹر ایک میٹر کا ایک ارب واں (Billionth) حصہ ہے۔ اس پر 200 سے 300 تک اُبھار (Projections) ہوتے ہیں۔ یہ وائرس کھانسے اور چھینک سے دوسروں میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ☆☆☆

سائنس کارنر

اکثر ہمارے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ کسی سائنسی لفظ (سائنسی اصطلاح) کا ترجمہ کرتے وقت ہم کسی عام سی لغت میں اس کے لفظ کا ترجمہ دیکھتے ہیں لیکن عام لغت میں لفظ کا ترجمہ کچھ اور ہوتا ہے جب کہ خاص سائنسی لغت میں اس کی وضاحت مختلف ہوتی ہے۔

سائنسی الفاظ کی دُنیا اپنی ذات میں بہت منفرد، اچھوتی اور بعض مرتبہ چکرا دینے والی ہوتی ہے مثلاً:

☆ سیل انگریزی لفظ "Cell" کا درست لفظی مفہوم تو ''بند کمرہ'' ہے لیکن جب ہم لغت میں دیکھیں تو اس کے کئی معانی ہوتے ہیں جیسے حیاتیات (بائیالوجی) میں اس کا ترجمہ خلیہ ہے۔ انجینئرنگ میں اس سے مراد وہ خانہ (بیٹری سیل) لی جاتی ہے جس میں توانائی ذخیرہ کی جائے۔ جدید ٹیلی مواصلات کے شعبے میں اس سے مراد تصوراتی علاقہ ہوتا ہے جس کے عین مرکز میں مواصلاتی مینار (یعنی سیلولر ٹاور) نصب ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں آج کل موبائل کے اُردو ترجمے جو لغت میں ملتے ہیں، وہ مخصوص پس منظر میں بیان کیے جاتے ہیں۔

مزید بڑھیں تو Cell کے ساتھ کسی لفظ کا اضافہ کر دیا جائے تو مفہوم بدل جاتا ہے جیسے Cell Phone سے مراد عام زبان میں موبائل فون ہے۔ Battery Cell کو اُردو میں بیٹری سیل ہی کہا جاتا ہے جو عموماً ٹارچ یا ٹرانسسٹر ریڈیو میں بجلی پیدا کرنے کے لیے لگایا جاتا ہے۔

Fuel Cell کا معیاری اُردو ترجمہ کا تعین نہیں ہو سکا۔ اسے ہم ایندھنی ذخیرہ خانہ لکھ سکتے ہیں۔ اس سے بھی بجلی پیدا کی جاتی ہے لیکن اس کا طریقہ کار بیٹری سیل سے قدرے مختلف ہے۔ اس میں ہائیڈروجن اور آکسیجن الگ الگ محفوظ ہوتی ہیں جنہیں ضرورت کے وقت آپس میں ملایا جاتا ہے جس سے پانی بنتا ہے اور توانائی خارج ہوتی ہے۔ اس توانائی کو بجلی میں تبدیل کر کے مطلوبہ مقاصد میں استعمال کیا جاتا ہے۔

Torture Cell کا سائنس سے کوئی تعلق نہیں لیکن اس کے متعلق خبروں میں پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ اس کی درست اُردو عقوبت خانہ ہے لیکن اخبارات، ٹی وی چینلز میں اس کا استعمال بہت کم رہ گیا ہے۔

☆ سیٹلائٹ (Satellite) سے مراد ہے نسبتاً دُور لیکن تابع لی جاتی ہے۔ البتہ موقع کی مناسبت سے لفظ کا مفہوم بدل جاتا ہے۔

فلکیات میں سیٹلائٹ کا ترجمہ سیارچہ ہے جب کہ اس سے مراد کسی سیارے کے گرد باقاعدہ مدار میں گردش کرنے والا کوئی جسم ہوتا ہے۔ یہ کوئی قدرتی چیز بھی ہو سکتی ہے اور انسان کی بنائی ہوئی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ نشریات اور ٹیلی مواصلات میں استعمال ہونے والے سیارچوں کو مصنوعی سیارچے (Artificial Satellite) جب کہ زمین کے چاند اور دوسرے سیاروں کے گرد (باقاعدہ مدار میں گھومنے والا) بڑے اجرام فلکی قدرتی سیارچے کہا جاتا ہے۔

سیاست کے میدان سیٹلائٹ اسٹیٹ (Satellite State) استعمال کیا جاتا ہے تو کسی ایسے ملک کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے جو بظاہر آزاد مملکت ہونے کے باوجود اپنے فیصلوں اور دوسرے اہم قومی امور میں کسی دوسرے بڑے ملک کا تابع ہوتا ہے، لہٰذا سیٹلائٹ اسٹیٹ کا اُردو ترجمہ غلام ریاست یا تابع ریاست کرنا بہتر ہے۔ ہم اسے سیارچہ ریاست نہیں کہہ سکتے۔

☆ اسی طرح انگریزی لفظ Kingdom بہت دل چسپ ہے۔ اس کا عام اردو ترجمہ سلطنت ضرور ہے لیکن بیالوجی کے تحت اس کی اُردو ''عالم'' کی جاتی ہے۔ تکنیکی اعتبار سے یہ چاہے کتنا ہی غلط ہو لیکن اصطلاح سازی کے ماہرین نے بائیالوجی کے سلسلے میں کنگڈم کے اُردو ترجمے کو ''عالم'' ہی معیاری قرار دیا ہے، لہٰذا انگریزی اصطلاح Plant Kingdom کو اُردو میں سلطنتِ نباتات نہیں کہا جا سکتا بلکہ اس کی معیاری اردو اصطلاح ''عالمِ نباتات'' ہوگی، لہٰذا Animal Kingdom کو عالم حیوانات کہیں گے۔

اسی تسلسل سے آگے بڑھیں گے تو Old Kingdom کی اُردو پرانی سلطنت یا قدیم سلطنت نہیں کی جا سکتی کیوں کہ اولڈ کنگڈم کا خصوصی تعلق قدیم مصر سے ہے۔ مصر میں فرعونوں سے پہلے جو سلطنت تھی اسے یہ نام دیا گیا ہے۔ اس سلطنت کا بادشاہ ''عزیزِ مصر'' کہلاتا تھا۔ (یوسفؑ کا زمانہ بھی اسی دور کا حصہ تھا) انگریزی کی اولڈ کنگڈم کا اُردو ترجمہ قدیم مصری سلطنت یا فرعون سے پہلے کی مصری سلطنت ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس جب مصر کی تاریخ کی بات کریں تو اسے New Kingdom کہا جائے تو اس سے مراد قدیم مصر کا وہ زمانہ ہے جب وہاں فراعنہ (فرعونوں) کی حکمرانی تھی۔ (موسیٰ کا زمانہ اسی دور کے تحت آتا ہے) مصری تاریخ اور آثارِ قدیمہ کے ضمن میں نیو کنگڈم کو جدید مصری سلطنت یا فراعنہ کا دورِ اقتدار کہا جا سکتا ہے۔ محض نئی سلطنت لکھ دینے سے کام نہیں بنے گا۔

☆☆☆

وہ دانائے، سُبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل، وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسین، وہی طٰہٰ

(محمد زوہیب، کوہاٹ)

ہر ابتدا سے پہلے ہر انتہا کے بعد
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

(محمد ضیاء اللہ، شائلہ ناز، میانوالی)

تیرے سجدے کہیں تجھے کافر ہی نہ بنا دیں اقبال
تو جھکتا کہیں اور ہے اور سوچتا کہیں اور ہے

(عذرا سعید، چکی شیخ جی)

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

(عبدالرحمن، راول پنڈی)

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے
ہوئے مدفونِ دریا زیرِ دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گہر نکلے

(زائش خورشید، ایبٹ آباد)

تیری ہستی شعور و عقل کے معیار سے بالا
سمجھ میں تو نہیں آتا دلِ مومن میں آتا ہے

(فتح محمد شارق، نوشہرہ خوشاب)

اللہ کرے اس چوکھٹ پر میری بھی رسائی ہو جائے
جس چوکھٹ پر دیوانوں کی تقدیر بنائی جاتی ہے

(منیزہ مریم، نوشہرہ خوشاب)

شکیب اپنے تعارف کے لیے فقط اتنا ہی کافی ہے
ہم اس سے ہٹ کے چلتے ہیں جو رستہ عام ہو جائے

جگہ جی لگانے کی دُنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی ہے تماشا نہیں ہے

(شانزے عزیز، تربیلہ)

وہ معزز ہوئے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

(محمد عبید اکرم شریف ہرنولی، میانوالی)

آنکھ جو دیکھتی ہے لب پر آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

(تماضر ساجد، صادق آباد)

دشت تو دشت ہیں، صحرا بھی نہ چھوڑے ہم نے!
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے!

(ذیشان احمد صدیقی، کندیاں)

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

(عشاء سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

وہ مرد نہیں جو ڈر جائے حالات کے خونی منظر سے
جس حال میں جینا مشکل ہو اس حال میں جینا لازم ہے

(فائقہ عابد، حافظ حذیفہ عابد، الٰہ آباد)

اقبال تیری قوم کا اقبال کھو گیا
ماضی تو سنہرا تھا مگر حال کھو گیا

☆

میری بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک افشانی

(نوریہ مدثر، خدیجہ مدثر، سیال کوٹ)

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

(محمد حسنات، راول پنڈی)

گاجر کا حلوہ

اجزاء:

گاجر:	ایک کلو	دودھ:	دو کلو	گھی:	ایک پاؤ
ملائی:	ایک پاؤ	چینی:	ایک پاؤ	چھوٹی الائچی:	چند دانے
کھویا:	آدھا پاؤ	بادام:	حسب ضرورت	ابلے انڈے:	دو سلائس

ترکیب: گاجروں کو کش کر کے کڑاہی میں ڈالیں۔ ساتھ دودھ بھی ڈال دیں اور اتنا پکائیں کہ دودھ خشک ہو جائے اور گاجریں گل جائیں۔ پھر گھی ڈال کر بھون لیں اور ملائی ڈال کر بھون لیں۔ اس کے بعد چینی شامل کریں اور مسلسل چمچ چلاتے ہوئے پکائیں کہ چینی کا پانی خشک ہو جائے۔ پھر کھویا ڈال کر ہلکا سا بھون لیں۔ آخر میں الائچی اور بادام ڈال کر اتار لیں۔ ابلے ہوئے انڈوں کے ساتھ سجا کر پیش کریں۔

پیزا

اجزاء:

خمیر:	ایک چائے کا چمچ	پانی:	آدھا کپ	میدہ:	8 اونس
چینی:	ایک چائے کا چمچ	نمک:	ایک چائے کا چمچ	مرغی:	ایک کپ ابلی ہوئی
آئل:	دو چائے کے چمچ	سرخ مرچ:	آدھا چائے کا چمچ	نمک:	حسبِ ضرورت
رائی پسی ہوئی:	آدھا چائے کا چمچ	تیل:	چار کھانے کے چمچ	ٹماٹو کیچپ:	چار کھانے کے چمچ
پنیر:	حسبِ ضرورت				

ترکیب: خمیر کو پانی میں ملائیں اور دس منٹ تک چھوڑ دیں۔ پھر اس میں میدہ، چینی، نمک ایک چائے کا چمچ اور تیل ملا کر گوندھ لیں۔ پھر روٹی بیل کر نرم کپڑے سے ڈھانپ دیں، حتیٰ کہ پھول کر دوگنا ہو جائے۔ اب مرغی میں رائی، سرخ مرچ اور نمک ملا دیں۔ تیل گرم کریں اور اس میں مرغی کو تلیں۔ پھر کیچپ ڈال کر گاڑھا گاڑھا بھون لیں۔ روٹی کو پزا ٹرے میں رکھیں۔ تھوڑی سی ٹماٹر کیچپ پھیلائیں۔ پھر مرغی کو پھیلائیں آخر میں پنیر کے ٹکڑے اوپر پھیلا دیں۔ اوون میں نصف گھنٹے تک پکائیں۔

ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا نے بارش میں بھیگی دسمبر کی اندھیری رات کو مزید یخ بستہ کر دیا تھا۔ وقفے وقفے سے چمکتی آسمانی بجلی سے آس پاس کی چیزیں نظر آنے لگتی تھیں۔ اس گرج چمک سے نالاں شیخ انور صاحب اپنی کوٹھی کے بائیں طرف والے کمرے میں ایک تکیے پر ٹیک لگائے متواتر سگریٹ کے کش لگانے میں مصروف تھے۔ یہ رات کے نو بجے کا وقت تھا۔ گیٹ پر ایک زور دار دستک نے شیخ صاحب کے آرام میں خلل ڈال دیا اور وہ جھٹ سے گھبرا کر اُٹھے۔ اپنی برساتی میں گیٹ تک پہنچے۔ ایک نہات سادہ لوح اور سردی میں ٹھٹھرتے اُدھیڑ عمر شخص نے ان کو سلام کیا۔ شیخ صاحب نے جواب میں سر ہلا دیا۔

"شیخ صاحب میرے چھوٹے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ بائیک سے گرنے کی وجہ سے اس کی بازو اور ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ ڈاکٹروں نے فوری آپریشن کے لیے دس ہزار مانگا ہے۔ برائے مہربانی مجھ پر ترس کھائیں اور میری مدد کر دیں، ورنہ میرا بھائی مر جائے گا۔"

وہ شخص ایک ہی سانس میں روتے روتے یہ سب بول گیا اور رحم وکرم کے لیے ہاتھ جوڑنے لگا۔ شیخ صاحب کی ایک ہی دھتکار نے اس کا دل چکنا چور کر دیا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے بدحرام...... دوسروں کا سکون برباد کرنے آ گیا ہے۔ میں نے ٹھیکہ نہیں اُٹھا رکھا ہے تمہارا...... نکلو یہاں سے کوئی پیسے نہیں ہیں۔"

وہ شخص سسکیاں لیتے ہوئے منہ چھپائے اور بغیر کچھ کہے اُلٹے قدموں لوٹ گیا۔ اس کا بھائی اسپتال میں اس کی نظروں کے سامنے ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔

"کون تھا اس وقت گیٹ پر......؟"

شیخ صاحب کی بیوی ان سے گویا ہوئی۔

"یہ ساتھ والی گلی سے شبو تھا، ریڑھی والا۔ دس ہزار روپے مانگتا تھا بھائی کے آپریشن کے لیے، بھگا دیا پاگل کے بچے کو۔"

شیخ صاحب نے نہایت غصیلے لہجے میں جواب دیا۔ اس کی بیوی منہ بسورتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ شیخ انور ایک مال دار اور امیر شخص تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غرور و تکبر جیسی لعنت اس کی رگ رگ میں سما چکی تھی اور پیسہ اس کے گردن کا سریا بنا ہوا تھا۔ کلف لگے کپڑے اس کی طبیعت کو اکڑائے رکھتے تھے۔ غریب و مفلس جیسے الفاظ سے ہی وہ حد درجہ نفرت کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے گاؤں والے بھی انہیں ناپسند کرتے تھے۔ وہ غریبوں کا بالکل خیال نہیں رکھتے تھے۔ ہمیشہ انہیں جوتے کی نوک پر رکھتے۔

کوئی فقیر اس کے دروازے پر آ جاتا تو اسے بھی بے عزت کر کے دھتکار دیتا۔

☆......☆......☆

چاروں طرف ناامیدی کے بادل منڈلاتے دکھائی دے رہے تھے۔ عادل بیڈ پر بے سدھ پڑا تھا اور ساتھ میں میز پر کچھ دوائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ عادل کی امی اسے ہوش میں لانے کے لیے کبھی اس کے پاؤں دبا رہی تھی تو کبھی پانی کے قطرے اس کے منہ میں ڈال رہی تھی لیکن یہ ٹوٹکے بھی ان کے گھر میں بہار لانے کے لیے بے سود تھے۔ شیخ صاحب بھی اپنے بیٹے کے پاس کرسی پر بیٹھے اس پر ٹکٹکی باندھے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں پچھتاوا اور ناامیدی عیاں تھی کیوں کہ اس کے بیٹے کے بچنے کے امکانات بہت کم تھے۔ شیخ صاحب کے بیٹے عادل کو ہیپاٹائٹس کا ایک موذی مرض لاحق تھا۔ اسے خون کی اشد ضرورت تھی۔ ایمرجنسی بلڈ بنک سے بھی عادل کے گروپ کا خون اس وقت نہیں مل رہا تھا۔ یہ موذی مرض وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عادل کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کر رہا تھا۔ عادل کے دن بدن کمزور ہونے کی وجہ سے اس کا شہر کے بڑے بڑے اور ماہر ڈاکٹروں سے علاج کروایا گیا لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔

اب عادل کو ڈاکٹر فواد خان کے پاس اسپتال میں داخل کروا دیا گیا جو اس شہر کے سب سے زیادہ بڑے اور قابل ڈاکٹر سمجھے جاتے تھے ان کی فیس بھی ہزاروں روپے تھی۔ اس کا باقاعدہ علاج شروع ہو گیا۔ کمزوری مزید بڑھ جانے کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے خون کی دو بوتلیں فوری طور پر تجویز کیں۔ یہ سن کر شیخ صاحب فوری طور پر اپنے گاؤں روانہ ہوئے اور مختلف نوجوانوں سے اپنے بیٹے عادل کے لیے خون کا عطیہ دینے کی درخواست کی لیکن کوئی بھی خون دینے پر تیار نہ ہوا۔ کوئی بھی ان کی بات سننے کو تیار نہ تھا کیوں کہ شیخ صاحب ان کو ہمیشہ دھتکارتے تھے۔ کبھی بھی اپنے علاقے والوں کی بات نہیں سنتے تھے۔ امید کا دامن ہاتھ میں لیے شیخ صاحب اپنے رشتہ داروں کی طرف بھاگے لیکن مشکل کی اس نازک گھڑی میں کسی رشتہ دار نے بھی ان کی مدد نہ کی۔ سب نے خون دینے سے مکمل انکار کر دیا اور مختلف بہانے کر کے جان چھڑا گئے۔ ناامید ہو کر شیخ صاحب اسپتال واپس پلٹے۔ خون نہ ملنے کی وجہ سے ڈاکٹروں نے انہیں مریض کو گھر لے جانے کو کہا۔

ناامیدی اور بے بسی کے عالم میں شیخ صاحب اپنی بیوی کے ساتھ اکیلے اپنے بیٹے کو گھر میں لے کر بیٹھے تھے اور خدا سے رو رو کر دعائیں مانگ رہے تھے۔ مغرب کے وقت اچانک دروازے پر زور دار دستک ہوئی، شیخ صاحب بھاگ کر دروازہ کھولنے کے لیے لپکے۔ ایک خوبصورت اور کڑیل جوان نے احتراماً سلام کیا اور اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اس نوجوان سمیت اسپتال میں موجود تھے۔

یہ نوجوان شیخ صاحب کے گاؤں میں لگے سیلابی کیمپ سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ بے گھر اور سیلاب سے متاثرہ نوجوان کسی دوست

کی زبانی عادل کی بیماری معلوم کر چکا تھا اور اس نے عادل کو خون دے کر اس کی جان بچانے کی ٹھان لی تھی، اس لیے وہ فوری طور پر عادل کی مدد کو پہنچا۔

مجاہد نامی یہ نوجوان شیخ صاحب کے اکلوتے بیٹے کے لیے کسی رحم دل فرشتے سے کم نہیں تھا۔ وہ کافی صحت منداور تندرست و توانا انسان تھا۔ اس نے عادل کے لیے وقفے وقفے سے خون کی دو بوتلیں دیں۔ قدرتی طور پر ان کا بلڈ گروپ بھی مل گیا تھا۔ دوسری بوتل ابھی ختم ہونے کو تھی کہ عادل نے چپکے چپکے آنکھیں کھول کر پُراسرار انداز میں جھانکنا شروع کر دیا۔ اپنے لخت جگر کو ہوش میں دیکھ کر شیخ صاحب اور اس کی بیوی خوشی سے رو اُٹھے۔ مجاہد کو ڈھیروں دعائیں دیں۔ شیخ صاحب اسے گلے لگا کر رو پڑے۔

''آج مجھے غریب انسانیت پر کیے ظلم یاد آ رہے ہیں، میں بہت ظالم اور جابر انسان تھا۔ ہمیشہ غریبوں کو دھتکارا ہے، ان کو حقیر جانا ہے لیکن آج ایک بے گھر نوجوان نے میری مدد کر کے میری گردن کا سریا توڑ دیا ہے۔ میرا سر شرم سے جھک گیا ہے۔ آج مجھے انسانیت کی قدر معلوم ہوئی ہے۔''

شیخ صاحب مسلسل روتے ہوئے یہ سب کہتے چلے گئے۔ خون لگنے کے کچھ دن بعد عادل بالکل تندرست ہو گیا۔ اب شیخ صاحب نے عہد کر لیا تھا کہ وہ کبھی غریبوں پر ظلم نہیں کرے گا۔ کبھی ان کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھے گا۔ ہمیشہ ان کی مدد کرے گا۔ نئے سال کی آمد آمد تھی۔ اس لیے وہ گاؤں والوں کو نئے سال کا ایک نیا تحفہ دینا چاہتا تھا۔

شیخ صاحب نے اپنے رب سے کیا وعدہ سچ کر دکھایا تھا۔ آج یکم جنوری یعنی نئے سال کا پہلا دن تھا۔ وہ واقعی ایک خوبصورت دن تھا جو کہ غریبوں کے لیے خوشی کی اُمنگ اور امید کی ایک روشن کرن تھا کیوں کہ آج شیخ صاحب غریب، لاچار اور بے روزگار افراد کی فلاح اور خدمت کے لیے ایک ویلفیئر سوسائٹی کا افتتاح کرنے والے تھے۔ اس افتتاحی تقریب میں گاؤں کے تمام چھوٹے بڑے لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔

اس موقع پر شیخ انور صاحب نے تمام حاضرین سے خطاب کیا:
''آج میں آپ سب لوگوں کے سامنے شرمندگی محسوس کر رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ محلے داروں، غریبوں حتیٰ کہ رشتے داروں کو

خون بہنے کا علاج

خون بہنے کو شدت کے مطابق مندرجہ ذیل مختلف اقدامات سے روکا جا سکتا ہے۔

1- زخم پر براہ راست ہاتھ سے دباؤ ڈالیں اور اس مقصد کے لیے اگر موجود ہو تو صاف پٹی پیڈ استعمال کریں۔

2- زخم پر دباؤ دیتے ہوئے جسم کے اس حصے کو اونچا کر دیں۔

3- دباؤ کے ساتھ مناسب کسی ہوئی پٹی کر دیں۔

4- اگر پٹی خون سے بھیگ جائے، تو پہلی پٹی کو کھولے بغیر اسی کے اوپر مناسب دباؤ سے مزید پٹی کر دیں۔

5- اگر مندرجہ بالا اقدامات سے خون نہ رُکے تو بازو یا ٹانگ کے پریشر پوائنٹ پر دباؤ دے کر بھی خون کو روکا جا سکتا ہے۔ (پریشر پوائنٹ: بازو یا ٹانگ کی خاص جگہوں پر خون کی نالیاں ہڈی سے متصل گزرتی ہیں جہاں ہاتھ یا انگوٹھے کے پریشر سے خون کے بہاؤ کو بآسانی روکا جا سکتا ہے)

6- اگر ان میں سے کسی اقدام سے خون کے بہنے پر قابو نہ پایا جا سکے، مثلاً بازو یا ٹانگ کے بُری طرح کچلے جانے کی وجہ سے ہر طرف سے خون کا بہنا ہو تو آخری حربہ متاثرہ حصے سے تھوڑا اوپر کس کر کم از کم دو انچ چوڑا کپڑا یا پٹی باندھ دیں۔ اس مقصد کے لیے رسی یا تار وغیرہ کا استعمال ہرگز نہ کریں۔ ایسے بندھے ہوئے حصے کو ایک گھنٹے سے زیادہ بندھا ہوا نہ چھوڑیں ورنہ وہ عضو ضائع ہو سکتا ہے۔

7- متاثرہ شخص کو جلد از جلد اسپتال منتقل کریں۔ اگر زخم معمولی بھی ہو تو اس کا علاج ضروری ہے، تاکہ زخم میں ریشہ نہ پڑ جائے۔

اگر متاثرہ شخص کا خون زیادہ بہہ جائے تو اس کی وجہ سے وہ صدمے کی حالت میں جا سکتا ہے۔

بھی حقیر جانا ہے۔ ان کو ظلم و زیادتی کا نشانہ بنایا ہے، لیکن ایک بے گھر نوجوان نے میرے بیٹے کی جان بچا کر مجھے سیدھی راہ دکھا دی ہے۔ میں آپ سب لوگوں کا مجرم ہوں، اللہ کے واسطے آپ سب مجھے سچے دل سے معاف کر دیں۔ یہ ویلفیئر سوسائٹی صرف غریبوں سے محبت اور ان کا دکھ بانٹنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہ فلاحی سوسائٹی ہمیشہ غریب، حق دار اور بے روزگار لوگوں کا سہارا بنے گی۔ ہمیشہ ان کی فلاح کے لیے کام کرے گی۔ اس میں کسی قسم کا کوئی ذاتی لالچ موجود نہیں ہے۔''

سب لوگوں نے انور صاحب سے اپنی رنجشیں اور شکایتیں بھلا دیں اور ہمیشہ ان کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ اس تقریب کے اختتام پر تمام غریب اور ضرورت مند افراد میں نئے سال کی آمد اور اپنے بیٹے کی صحت یابی کی خوشی میں مٹھائی اور گھریلو راشن پر مشتمل خصوصی پیکج تقسیم کیے گئے۔

☆☆☆

پہلے سفر کے بعد میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب زندگی سکون سے گزاروں گا لیکن تھوڑے عرصے بعد سمندری سفر کی خواہش نے میرے دل میں سر اُبھارا۔ آہستہ آہستہ اجنبی علاقے دیکھنے کی یہ تڑپ بڑھتی چلی گئی۔ آخر ایک دن میں نے بغداد سے سامانِ تجارت خریدا اور سفر کرتا ہوا بصرہ کی بندرگاہ پہ جا پہنچا۔

اگلے دن سمندری سفر شروع ہو گیا۔ میرے ساتھ آٹھ دس تاجر اور بھی تھے، یوں بحری جہاز میں تاجروں کی ایک جماعت سی بن گئی تھی۔ ہمارا طریقہ یہ تھا کہ ہم اپنا سامان بیچتے اور نیا خرید لیتے۔ اس طرح ہم منزلوں پہ منزلیں مارتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ میرے ساتھی تاجر انتہائی خوش اخلاق تھے۔ سفر میں دعوتیں بھی ہوتیں اور تحفوں کا لین دین بھی۔ غرض بڑی عمدگی سے ہمارا سفر جاری تھا۔

ایک دن ہم ایک بے آباد جزیرے پر اُترے۔ پچھلے سفر میں جسے ہم جزیرہ سمجھ بیٹھے تھے، وہ دراصل ایک بہت بڑی وہیل مچھلی تھی لیکن یہ جزیرہ واقعی جزیرہ تھا۔ ہم ساحل پر اُتر کر ذرا آگے بڑھے تو جزیرے کی باغ و بہار دیکھ کر حیران رہ گئے۔

ہر طرف جنگلی پھول کھلے ہوئے تھے۔ ان کے بیچ پھل دار درخت لہرا رہے تھے۔ نیچے زمین پر مخمل جیسی سبز گھاس اُگی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے پھولوں والی جنگلی بیلیں اپنی بہار دکھا رہی تھیں۔ سمندر کی طرف سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایسی ٹھنڈی ہوا آتی کہ سارا ماحول خوشبو سے مہک جاتا۔ جزیرے پر خاموشی نہ تھی بلکہ خوش آواز پرندے یہاں وہاں گیت گا رہے تھے۔ میں نے ایسے شوخ رنگوں کے پرندے زندگی میں نہ دیکھے تھے۔ میرے ساتھی ہر طرف پھیل گئے اور سیر و سیاحت کا لطف اُٹھانے لگے۔

تھوڑی دیر بعد ہم نے پھل توڑے اور آپس میں بیٹھ کر کھائے۔ اس کے بعد ہم سب دوبارہ چہل قدمی کرنے لگے۔ میں اس دوران ایک طرف کو نکل آیا اور ایک درخت سے ٹیک لگا لی۔ کچھ تو یہ جادو بھرا ماحول اور کچھ رس بھرے پھل کھانے کا اثر تھا کہ میری آنکھ لگ گئی۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنی دیر سویا، البتہ جب اُٹھا تو ہر طرف سنسانی تھی۔ میں جھٹکا مار کر کھڑا ہوا اور اپنے ساتھیوں کو آواز دی لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ میں دوڑ کر ساحل پر آیا تو دیکھا کہ جہاز ساحل سے کئی میل دُور اگلی منزل کی طرف روانہ ہو چکا ہے۔

میں گلا پھاڑ کے چلایا اور اپنے ساتھیوں کے نام پکارنے لگا لیکن یہ سب بے فائدہ رہا۔ میری حالت اس وقت دیکھنے والی تھی۔ میں ساحل پر اُچھلا کودا، جہاز کی طرف پتھر پھینکے اور زور زور سے

منہ سے آوازیں نکالیں لیکن یہ سب لہروں کے شور میں دب گئیں اور جہاز آہستہ آہستہ میری نظروں سے دُور ہو گیا۔

اب کیا ہو سکتا تھا، میں مایوسی کے عالم میں واپس آیا۔ سورج ڈھل رہا تھا۔ وہی جزیرہ جو چند گھنٹے پہلے مجھے بڑا خوش نما معلوم ہو رہا تھا، اب کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ اب میرا کیا بنے گا؟ تھوڑی دیر میں یوں ہی بیٹھا رہا، پھر ایک بلند درخت پر چڑھ کر جزیرے کا جائزہ لیا۔ جزیرے کے درمیان میں ایک صاف میدان تھا اور یہاں ایک مسجد کا گنبد نظر آ رہا تھا۔ میں نے درخت سے اُتر کر اپنا سامان سمیٹا، خوراک کے تھیلے کو کمر سے باندھا اور گنبد کی طرف چل پڑا۔

مجھے بار بار اس بات پر حیرانی ہو رہی تھی کہ یہ جزیرہ بے آباد کیوں ہے اور اس پر کوئی انسان اب تک کیوں نہیں نظر آیا؟ بہر حال میں ایک میدان میں پہنچا۔ میدان کے درمیان میں پچاس ساٹھ گز لمبا اور اونچا ایک بہت بڑا سفید پتھر پڑا تھا۔ میں جسے مسجد کا گنبد سمجھ رہا تھا، وہ یہی سفید پتھر تھا۔ میں اس کے چاروں طرف گھوما، پھر اس پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن کام یاب نہ ہو سکا۔ حیرانی اس بات کی تھی کہ یہ ہے کیا؟ جب ہر طرف سے ناکام ہو گیا تو پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

ابھی مجھے بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ آسمان پر اندھیرا چھا گیا۔ میں نے اُوپر کی طرف دیکھا تو میری نگاہیں خوف زدہ ہو کر واپس پلٹ آئیں۔ پھر دوبارہ دیکھا تو پھر ڈر کر نظریں جھکا لیں۔

آسمان پر پہاڑوں جتنی بڑی ایک چیل پھڑپھڑا رہی تھی اور اس کے اس طرح پھڑپھڑانے سے فضا میں بھونچال سا آ گیا تھا۔ میں نے بعض ملاحوں سے ایک بہت بڑے پرندے کے بارے میں سنا تھا جسے "رُخ" کہتے ہیں۔ یہ پرندہ ویران علاقوں میں رہتا ہے اور اتنا بڑا ہوتا ہے کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔

میں ان سب باتوں کو گپ سمجھتا تھا لیکن اب دیکھا کہ اس وقت فضا میں ایک ایسے ہی قد و قامت کا پرندہ اُڑ رہا ہے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہی رُخ پرندہ ہے کیوں کہ اس کے پَروں کی وجہ سے سورج کی روشنی جزیرے پر آنے سے رُک گئی تھی۔

جلد ہی وہ پرندہ فضا میں تیرتا ہوا اس پتھر کی طرف بڑھنے لگا جس کے ساتھ میں ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ تب میں سمجھا کہ جسے میں سفید پتھر سمجھ رہا ہوں، وہ دراصل رُخ کا انڈہ ہے۔ پرندہ اُوپر آ کر اپنے آپ کو اس حالت میں لے آیا جیسے انڈے پر بیٹھنا چاہتا ہے۔ پھر ہوا بھی ایسے، رُخ مجھ سمیت اپنے انڈے کو ڈھانپ کر بیٹھ گیا۔ پرندہ اس طرح بیٹھا تھا کہ اس کا چنگل میرے سامنے تھا۔ رُخ کے پنجے کو پنجے کی بجائے چنگل کہنا زیادہ مناسب ہے کیوں کہ یہ چنگل بھی برگد کے درخت کے تنے کے برابر موٹا تھا۔ مجھے اس دوران ایک بات سُوجھی۔ وہ یہ کہ اگر میں رُخ کے چنگل کے ساتھ اپنے آپ کو باندھ لوں تو صبح جب یہ یہاں سے اُڑے گا تو مجھے بھی یہاں سے دُور لے جائے گا۔ سچی بات یہ ہے کہ میرا دل اس جزیرے پر بہت گھبرا رہا تھا، یہاں نہ آدم تھا نہ آدم زاد۔

میں نے فوراً اس منصوبے کو عملی جامہ پہنایا اور اپنی پگڑی کھول کر خود کو چنگل کے ساتھ مضبوطی سے باندھ لیا۔

منصوبہ کام یاب رہا۔ صبح جب رُخ اُڑا تو اپنے ساتھ مجھے بھی آسمانوں کی بلندیوں میں لے گیا۔ زمین مجھ سے پیچھے نہ جا رہی تھی۔ پہاڑ چھوٹے چھوٹے دکھائی دیتے تھے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں کبھی اتنی اُونچائی پر پرواز کروں گا۔ دریا چھوٹی چھوٹی نالیاں معلوم ہوتے تھے۔

کافی دیر یوں ہی گزر گئی۔ پھر رخ نے اُترنا شروع کیا۔ اتنی تیزی سے زمین کی طرف آ رہا تھا کہ مجھے اپنے دل کی دھڑکن رُکتی محسوس ہوئی۔ میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے ہی رُخ کے پنجوں نے زمین کو چھوا میں نے جھٹ سے پگڑی کھولی اور خود کو آزاد کرا لیا۔

رُخ اس دوران قریب موجود ایک بڑے سے اژدھے پر جھپٹا اور پھر اُوپر کی طرف اُڑ گیا۔ میں نے لیٹے لیٹے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ جس جگہ پر رُخ نے مجھے لا ڈالا تھا وہ بلند و بالا پہاڑوں سے گھری ہوئی وادی تھی۔ پہاڑوں کی چٹانیں اتنی اُونچی تھیں کہ بادلوں کو چھوتی محسوس ہو رہی تھیں اور ایسی سیدھی کہ کوئی بھی ان پر چڑھ نہ سکتا تھا۔ ان بلند چوٹیوں کے مقابلے میں وہ زمین جہاں میں گرا پڑا تھا اتنی نیچی معلوم ہوتی تھی کہ بیان نہ کیا جا سکتا تھا۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ اب کیا کروں؟ پہلے وہ بے آباد جزیرہ تھا اور اب یہ سبز وادی، یعنی میں ایک مصیبت سے چھٹ کر دوسری میں پھنس گیا تھا۔

تھوڑی دیر میں یوں ہی بیٹھا رہا، پھر سر جھٹک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ انسان خواہ کچھ ہی کیوں نہ کرے وہ تقدیر سے نہیں لڑ سکتا۔ میں نے بھی تقدیر کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور گھوم پھر کر وادی کا جائزہ لینے لگا۔

وادی چھوٹی سی تھی لیکن اس کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں وہاں چھوٹے بڑے ہیرے بکھرے پڑے تھے۔ میں نے اتنی کثرت سے ہیرے آج تک نہ دیکھے تھے۔ ان رنگ برنگے جواہرات پر جب سورج کی کرنیں پڑتیں تو ساری وادی منور ہو جاتی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ انتہائی قیمتی ہیروں کی ایک قدرتی وادی ہے جو آبادی سے دُور دراز کہیں واقع ہے۔

چمڑے کا تھیلا میرے ساتھ تھا۔ اس میں جو بھی چیز رکھی جائے، محفوظ رہتی ہے۔ میں نے اس میں سے آخری کھانا نکال کر کھایا۔ جب تک جزیرے پر تھا تو جنگلی پھلوں پر گزارہ کرتا رہا۔ یہ آخری خوراک بچی تھی جو میں نے اس وقت کھائی۔ اس بچے کھچے اور تھوڑے سے کھانے کی قدر و قیمت مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب میرے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ سارا دن یوں ہی گزرا اور میں وادی میں گھومتا پھرتا رہا۔ پھر شام ہو گئی اور آہستہ آہستہ سورج غروب ہونے لگا۔ وادی میں اندھیرا ذرا جلدی پھیل گیا۔ اسی دوران ایک عجیب واقعہ ہوا۔ روشنی کم ہوتے ہی پہاڑی غاروں سے بڑے بڑے اژدہے نکل کر وادی میں پھیلنے لگے۔ یہ اژدھے جسامت میں اتنے بڑے تھے کہ ان میں سے سب سے چھوٹا ہاتھی کو سالم نگل سکتا تھا۔

رُخ پرندہ ان کا جانی دشمن تھا۔ دن کے وقت یہ اپنے اس دشمن سے بچنے کے لیے غاروں میں چھپے رہتے اور اندھیرا ہوتے ہی وادی میں چاروں طرف رینگنے لگتے۔ یہ بڑا ہی مصیبت ناک منظر تھا۔ سانپ چاروں طرف بڑھ رہے تھے اور ان کی پھنکاروں سے سارا ماحول گونج رہا تھا۔

مجھے اور تو کچھ سمجھ نہ آیا، میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا اور آخرکار ایک چٹان سے آ لگا۔ سانپ تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ اس چٹان میں ایک چھوٹی سی کھوہ تھی جو پیچھے اور نیچے کو بنی ہوئی تھی۔ اس میں ایک آدمی مشکل سے سما سکتا تھا۔ میں فوراً کھوہ کے اندر سرک گیا اور اس کے دھانے کو ایک پتھر سے اس طرح بند کر لیا کہ ہوا آتی رہے۔

اژدھے رات بھر وادی میں پھنکارتے پھرتے رہے اور میں بھی ساری رات کھوہ میں چھپا رہا۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ رات میں نے کس قدر خوف اور اذیت کی حالت میں بسر کی۔

صبح جب سورج نکلا اور روشنی پھیلی تو یہ بلائیں واپس غاروں میں گئیں۔ میں بھی کھوہ سے نکل آیا اور ایک پتھر پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ خدایا! اب میں کیا کروں؟ میرے پاس جو آخری کھانا بچا تھا وہ میں کل کھا چکا تھا۔ رات بھر سویا نہ تھا۔ اب بھوک اور تھکن سے میرا بُرا حال تھا۔ میں نے اللہ کو یاد کیا کیوں کہ اب صرف وہی میرا کارساز رہ گیا تھا۔ اتنی دیر میں سورج ذرا اُوپر چڑھ آیا اور اس کی نرم نرم کرنیں ساری وادی کو چمکانے لگیں۔

میرے سامنے ہزاروں رنگ برنگے ہیرے پڑے تھے لیکن مجھے ان کی کوئی طلب نہ تھی بلکہ میرا دل تو یہ کہہ رہا تھا کہ کاش کوئی شخص مجھ سے یہ سارے ہیرے لے لے اور ایک وقت کا کھانا دے دے۔ انسانی فطرت بھی عجیب ہے۔ جب میرے پاس کھانا تھا تو ہیروں کی طلب تھی، اب ہیرے ملے ہیں تو کھانے کی چاہت ہے۔

کیوں کہ رات بھر جاگا تھا اس لیے فوراً آنکھ لگ گئی۔ ابھی مجھے سوئے ہوئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ کوئی چیز دھم سے میرے قریب آ کر گری۔ میں نے اُٹھ کر دیکھا تو گوشت کا ایک بڑا سا

ٹکڑا تھا۔ اسی دوران قریب ہی ایک اور گوشت کا ٹکڑا آ کر گرا۔ پھر جو اُوپر نگاہ کی تو دیکھا کہ کئی اس طرح کے بڑے بڑے ٹکڑے چٹانوں پر سے لڑھکتے چلے آ رہے ہیں۔

میں نے بعض ملاحوں سے ہیروں کی وادی کے بارے میں سنا تھا۔ اس وقت میں ان سب باتوں کو خیالی قصے سمجھتا تھا اور کہتا تھا کہ بھلا ایسے بھی ہو سکتا ہے لیکن اب یقین کیے بغیر چارہ نہ تھا کیوں کہ میں خود ہیروں کی وادی میں موجود تھا۔

میں ان گوشت کے ٹکڑوں کے بارے میں بھی جانتا تھا۔ بات یہ تھی کہ اس وادی کو ''عقابوں کی وادی'' بھی کہتے تھے کیوں کہ ان پہاڑوں کی چوٹیوں میں کثرت سے عقاب رہتے تھے۔ تاجر لوگ تازہ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے کاٹ کر وادی میں پھینکتے۔ ان ٹکڑوں کے ساتھ ہیرے جواہرات چمٹ جاتے۔ عقاب گوشت کی تلاش میں وادی میں اُترتے اور ان ٹکڑوں کو اُٹھا کر اپنے گھونسلوں تک لے آتے۔ تاجر منہ سے آوازیں نکال نکال کر شور مچاتے اور عقاب کو اپنے گھونسلے سے اُڑنے پر مجبور کر دیتے۔ پھر گوشت پر چپکے ہوئے جواہرات اُتار لیتے۔ اس طرح تاجروں کو ہیرے مل جاتے اور عقابوں کو گوشت۔

میں نے یہ سب باتیں ملاحوں سے بہت مرتبہ سنی تھیں۔ مجھے پتا تھا کہ ابھی عقاب آئیں گے اور ان ٹکڑوں کو اُٹھا لے جائیں گے۔ اس سے تھوڑی دیر پہلے میں یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے اس وادی میں بھوک پیاس کی حالت میں موت آئے گی اور میرے گھر والوں کو پتا بھی نہ چلے گا کہ میں کس جگہ کس حالت میں تڑپ تڑپ کر مر گیا لیکن اب ان ٹکڑوں کو دیکھ کر میرے دل میں زندگی کی ہلکی سی اُمید پیدا ہوئی۔

میں نے فوراً اِدھر اُدھر سے کچھ ہیرے اکٹھے کیے اور اپنا تھیلا بھر لیا۔ پھر میں نے ایک گوشت کے ٹکڑے کے ساتھ اپنے آپ کو اس طرح باندھ لیا کہ میں اس کے نیچے چھپ سا گیا۔ میں نے اسی بات کا دھیان رکھا کہ تھیلا بھی میرے ساتھ مضبوطی سے بندھا رہے۔

جلد ہی عقابوں نے وادی میں اُترنا شروع کیا۔ ایک عقاب اس ٹکڑے پر بھی جھپٹا جس کے ساتھ میں بندھا ہوا تھا اور پنجوں میں دبا کر اُوپر کی طرف اُڑا۔ اس طرح میں عقاب کے گھونسلے تک پہنچ گیا۔ پھر وہی ہوا جس کی مجھے اُمید تھی۔

کئی آدمی اُونچی اُونچی بے ہنگم آوازوں میں شور کرتے ہوئے گھونسلے کی طرف آتے اور وہاں مجھے بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ابھی وہ کچھ سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ میں نے ان سے کہا: ''خدا کے بندو! گھبراؤ مت، میں عام انسان ہوں۔ پہلے میری کہانی سن لو پھر جو جی چاہے کرنا۔''

یہ کہہ کر میں نے شروع سے اب تک ان کو اپنی ساری داستان کہہ سنائی۔ انہوں نے مجھے تسلی دی اور اپنے ساتھ اپنے ٹھکانے پر لے آئے۔ یہاں آ کر سب سے پہلے مجھے کھانا کھلایا اور سونے کا موقع دیا۔ جب پیٹ بھرا اور آرام بھی ہو گیا تو میری طبیعت خاصی بحال ہو گئی اور میں نے سکھ کا سانس لیا۔

یہ تاجر حلب نامی شہر سے آئے تھے اور بڑے اچھے لوگ تھے۔ ہر سال جب عقابوں کا انڈے سینے کا موسم ہوتا تو یہ یوں ہی اس وادی میں آتے تھے اور اسی طریقے سے ہیرے حاصل کرتے تھے۔ میں کئی دن ان کے ساتھ رہا۔ اس دوران میں نے وادی سے حاصل کیے ہوئے ہیرے انہیں دکھائے۔ میرے ہیرے ان سب کے ان ہیروں سے زیادہ قیمت کے تھے جو انہوں نے ابھی تک حاصل کیے تھے۔

پھر میں نے گھر واپس جانے کا ارادہ کیا لیکن جانے سے پہلے ایک نیک کام یہ کیا کہ وہ سارے ہیرے ان تاجروں کو بخش دیئے کیوں کہ وہ میرے محسن تھے اور انہی کی وجہ سے میری جان بچی تھی۔ تاجر ہیروں کا تحفہ پا کر بہت خوش ہوئے اور اصرار کیا کہ کم از کم ایک ہیرا تو میں خود بھی رکھ لوں۔ میں نے ان کے اصرار سے مجبور ہو کر ایک ہیرا لے لیا۔ پھر وہ مجھے قریبی بندرگاہ تک چھوڑ آئے۔

میں وہاں سے بصرہ آیا اور بصرہ سے پھر بغداد اپنے گھر واپس آ گیا۔ وہ ایک ہیرا جو میں اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ میں نے شہر میں فروخت کر دیا۔ مجھے اس کے بدلے ڈھیروں اشرفیاں ملیں۔ میں نے یہ دولت حاصل کر کے پہلا کام یہ کیا کہ اس کا ایک تہائی حصہ غریبوں میں تقسیم کر دیا۔ پھر سارے شہر کی دعوت کی اور انہیں اپنے اس حیرت ناک سفر کے بارے میں بتایا۔ لوگوں کو میری کہانی کا یقین نہ آیا لیکن جب انہوں نے اتنا بیش قیمت ہیرا دیکھا تو مان گئے۔ اس طرح میرا دوسرا سمندری سفر جو پہلے سے بھی زیادہ دل چسپ اور انوکھا تھا، اپنے انجام کو پہنچا۔

☆☆☆

''خبردار! ذرا سی بھی مزاحمت کی یا چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو......تو گولی سینے میں اتار دوں گا۔ سمجھے!'' رات کے گھپ اندھیرے اور خاموشی میں احمر کی آواز گونجی۔ پروفیسر انوار جو کہ یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے، اچانک دو گھبرو نوجوانوں کے یوں پستول ہاتھ میں پکڑے سامنے آنے پر گھبرا گئے۔ رات کا ایک بجنے کو تھا اور وہ اپنی بیٹی کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے جو سیلاب زدگان کے لیے لگائے گئے امدادی کیمپ میں ڈاکٹری کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ اسی وجہ سے وہ دروازہ کھلا چھوڑ آئے تھے۔ اس اچانک افتاد سے انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا، آخر ہمت کر کے وہ بولے: ''کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟''

''کچھ نہیں، انکل! صرف پناہ چاہتے ہیں۔'' دوسرا نوجوان عثمان بولا۔ ''تھوڑی دیر تک حالات ٹھیک ہوتے ہیں تو ہم چلے جائیں گے۔''

''پناہ...... ہوں...... اگر تم پناہ کے متلاشی ہو تو میں نے تمہیں پناہ دی ہے۔ اب یہ پستول تانے کیوں کھڑے ہو؟ نیچے کرو اسے، اگر میری بیٹی آ گئی تو ڈر جائے گی۔'' اس مرتبہ ان کا لہجہ بھی کرخت ہو گیا۔

''سوری انکل! لیکن اپنی حفاظت کے پیشِ نظر میں یہ نیچے نہیں کر سکتا۔'' اس بار بھی عثمان ہی بولا جب کہ احمر اپنی کلائی پکڑے کھڑا رہا جس سے خون کے قطرے زمین پر گر رہے تھے اور پروفیسر انوار کی نظریں اس پر جم گئیں۔

''تم لوگ مسلمان ہو، تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان جب کسی کو پناہ دیتے ہیں تو اپنے سے بڑھ کر اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ ویسے لب و لہجے سے تم لوگ پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ گردشِ روزگار نے تمہیں اس دوراہے پر لا کھڑا کیا ہو گا۔'' یہ کہتے ہوئے پروفیسر نے الماری سے فرسٹ ایڈ بکس نکالا اور احمر کی کلائی پکڑ لی اور پولیس کی لگی گولی نکالنے لگے۔

''انکل! رہنے دیں، معمولی سا زخم ہے، خود ہی بھر جائے گا۔ آپ زحمت نہ کریں۔'' عثمان کے کہنے پر پروفیسر نے حیران کن نظروں سے اسے دیکھا اور بولے: ''تم اسے معمولی کہہ رہے ہو، جانتے ہو کہ اگر تمہاری ماں اسے دیکھ لے تو وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے گی مگر تم اس سے ناواقف ہو کیوں کہ تم میں احساس نہیں۔''

''رہنے دیں! ہمیں کوئی شوق نہیں لیکچر و ٹیچر سننے کا۔'' ان کی بات اس بار احمر نے کاٹی جو کافی دیر سے انہیں گھور رہا تھا۔

''تم لوگوں نے کھانا کھایا ہے؟ نہیں نا، چلو شاباش اُٹھو! منہ ہاتھ دھو لو، میں مائیکرو ویو میں کھانا گرم کر کے لاتا ہوں۔'' انہوں

نے بات کو گول کرنے کی کوشش کی تو احمر بول اُٹھا: ''نہیں، پولیس چلی گئی ہے، اب ہمیں جانا چاہیے...... اُٹھو!'' اس پر عثمان بہت سٹپٹایا کیوں کہ اسے زوروں کی بھوک لگی تھی اور اس کی شکل دیدنی تھی۔ ''اس میں زحمت کی کوئی بات نہیں، تم لوگ میرے بیٹے کی طرح ہو۔ اُٹھو اور ہاں، اگر تمہیں یہ خدشہ ہو کہ میں کھانا لینے جانے کے بہانے تمہیں پکڑوا دوں گا تو تم شوق سے میرے ساتھ جا سکتے ہو۔'' پروفیسر کی آنکھیں نم ہوگئیں، شاید انہیں اپنا کھویا بیٹا یا خاندان یاد آ گیا تھا۔ وہ جلدی سے پلٹ گئے۔

''یار! ایسی باتوں میں بے احتیاطی اچھی نہیں، چل اُٹھ! بھاگ چلیں۔'' احمر نے عثمان کو کہنی ماری تو وہ بولا: ''نہیں، پروفیسر ایسے آدمی نہیں، ورنہ وہ تمہارا زخم اتنی محنت سے صاف نہ کرتے اور نہ مرہم پٹی کرتے۔'' ابھی وہ یہ باتیں کر رہے تھے کہ انہیں پروفیسر کے بلانے کی آواز سنائی دی تو وہ جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر کچن میں چلے گئے۔

''اب! یہ مائیکرو ویو نے کتنی آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔ آ جاؤ، لو تمہارا یہ شک بھی دُور ہو جائے کہ کھانے میں کہیں زہر نہ ہو۔'' یہ کہہ کر پروفیسر نے دو تین چمچ منہ بھر کے چاول کھائے۔

''انکل! شرمندہ تو نہ کریں۔'' احمر بولا تو پروفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا: ''تم لوگ بہت بہادر ہو، کتنے خطرات سے کھیلتے ہو۔ ویسے کتنا پڑھے ہو؟''

''میں ایم اے اسلامیات اور عثمان ایم اے مطالعہ پاکستان کر چکا ہے۔'' احمر یہ کہہ کر چپ ہو گیا مگر عثمان بول اُٹھا: ''انکل! ہمیں غلط نہ سمجھنا، ہم نے سوچا تھا کہ ایم اے کے بعد ہمیں نوکری مل جائے گی کیوں کہ ہمارے والدین کو ہم سے توقع تھی کہ ہم ان کے لیے کما کر لائیں گے مگر ایسا نہ ہو سکا۔ پھر ہم نے اپنا حق لینے کی خاطر ڈاکہ زنی کا پیشہ اختیار کیا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز رندھ گئی، گویا آنسوؤں کا گولہ حلق میں اٹک گیا ہو۔

''اگر تمہیں لیکچر نہ لگے تو میں تمہیں اپنی کہانی سناؤں؟'' پُرنم آنکھوں سے پروفیسر بولے تو عثمان فوراً بول اُٹھا: ''ضرور انکل! کیوں نہیں...... ضرور سنائیں۔''

''یہ 1947ء کی بات ہے جب میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ 3 جون کا منصوبہ برٹش گورنمنٹ پاس کر چکی تھی۔ پٹیالہ اور دوسری جگہوں کا یہ حال تھا کہ جگہ جگہ شعلے فضاؤں میں بلند تھے، آگ کے...... لڑائی جھگڑے، لوٹ مار، عصمت دریوں کا بازار گرم تھا۔ خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ لوگوں نے نقل مکانی کرنا شروع کر دی۔ پاک سرزمین کی جانب، میں اپنے بھائی اور جگری یاروں کے ہمراہ اپنے محلے کی حفاظت پر معمور تھا۔ 11 اگست کی رات اچانک فضا گولیوں کی آواز سے گونج اُٹھی۔ مسلح افراد، سکھوں اور ہندوؤں کے جتھے نے ہمارے محلے پر بلہ بول دیا تھا۔ رات کے اندھیرے کا فائدہ اُٹھایا گیا تھا۔ یہ ٹولی رواں دواں تھی اور ہم برسرِ پیکار جواں مردی سے لڑتے رہے، یہاں تک کہ والد صاحب شدید زخمی ہو گئے۔ کسی طرح انہیں اسپتال پہنچایا لیکن اس جھڑپ میں مَیں اپنی تین بہنوں اور والدہ کو نہ بچا سکا۔ ان کی خون میں لت پت لاشوں کو بقیہ لاشوں کے ساتھ دفنا دیا مگر کیسے......؟ ایک دوسرے کے اوپر ڈھیر لگا کے، ایک بڑے گڑھے میں بے گور وکفن لاشیں، صرف ان کو بے حرمتی سے بچانے کی خاطر...... پھر پاکستان کا اعلان ہو گیا۔ پھر لڑتے لڑتے، ہمارے سارے ساتھی شہید ہو گئے، قربان ہو گئے۔ میں اور نثار بچ گئے۔ ایک عیسائی برادری نے رات کے اندھیرے میں ہمیں چھپا کر بھگا دیا مگر ایک سکھ نے ہمیں دیکھ لیا اور اب کی بار قضا نثار کی آئی تھی۔ والد کے پاس بمشکل پہنچا تو ایک برٹش رپورٹر ان کے پاس کھڑا تھا۔ نثار کی موت کا سن کر ان کی حالت غیر ہوگئی اور وہ بولے: ''اب سچ چھاپنے کا وقت ہے۔ میری شریکِ حیات، بیٹیوں کے بعد اب میرا لختِ جگر بھی مجھ سے چھین لیا گیا ہے۔ یہ ہے برٹش ہندو گٹھ جوڑ...... انوار...... کسی طرطرطرح...... چل چل چلے یے...... جاؤوؤ...... پاکستان...... لڑنا، مرنا...... وطنِ ن ن ن...... کے لیے ے ے ے...... ن ن نثارررر مجھے بلا...... رہا ہے......!'' پھر بجو، لائبہ، چٹکی اور امی کی طرح ابو بھی مجھے حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ گئے۔ ان کی ہدایت کے مطابق میں وطن کی جانب روانہ ہوا۔

راستے میں نہایت دل خراش مناظر دیکھے۔ ہر سمت چیخوں کا عالم تھا۔ تلواروں کے سائے میں ہم چھپتے چھپاتے چلتے رہے۔ آگ کے شعلے آسمانوں کو چھو رہے تھے۔ بستیاں جل رہی تھیں، عزتیں لٹ رہی تھیں، لاشیں بکھری تھیں، سر کٹ رہے تھے، خاندان اجڑ رہے تھے۔ پھر میں پاکستان پہنچ گیا جس کی خاطر سب

کچھ لٹا آیا تھا۔ ہم نے شکر کے سجدے کیے۔ ہم میں حوصلہ تھا، آنسو ہر چہرے پر تھے۔ پھر میں نے وطن کے لیے تعلیم وقف کر دی لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ ایک بار پھر میرا خاندان لٹنے والا ہے۔ 1971ء میں جب مشرقی بنگال علیحدہ ہوا تو میرا بیٹا، شریکِ حیات مجھ سے چھین لیے گئے۔ نرگس کو بچاتا خود زخمی ہوا مگر پھر دوسری بار خاندان قربان کر کے نئے پاکستان پہنچا۔

نرگس کو میں نے وطن کے لیے لڑ کر مرنے کا احساس دلایا۔ یہی وجہ ہے کہ آدھی رات گزر جانے کی پرواہ کیے بغیر وہ امدادی سرگرمیوں میں پیش پیش ہے۔ یہ خونی رشتہ نہیں، احساس کا رشتہ ہے جس کی اس نے لاج رکھی ہے۔ آنکھیں نیند سے بوجھل ہیں، جسم تھکن سے چُور ہے مگر اسے پرواہ نہیں۔ اور...... اور ایک تم ہو کہ مطالعہ پاکستان اور اسلامیات میں ایم اے کرنے کے باوجود اس کی اساس نہیں سمجھ پائے۔ تم لوگوں میں مجھے میرا بیٹا نظر آیا تو مجھے لگا کہ ابھی مجھے پھر خاندان قربان کرنا ہے۔ خدارا اس ملک کو بچا لو۔ خدارا! راہِ راست پر لوٹ آؤ۔ خونی رشتے سے نہ سہی، احساس کے رشتے کے ناطے ہی سہی۔'' ان کی ہچکی بندھ گئی، وہ زار و قطار رو رہے تھے، انہوں نے ہاتھ جوڑ رکھے تھے جب عثمان نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔

''انکل! ہمیں معاف کر دیں۔'' اتنی دیر میں دروازہ کھٹکا تو ان میں حیرانی کی لہر دوڑ گئی۔ دروازہ کھلا تو نرگس کھڑی تھی، بولی: ''ابو! صبح ہونے کو ہے، آپ سوئے نہیں......؟''

''واقعی! صبح ہونے والی ہے، میرے کچھ سٹوڈنٹس مجھ سے ملنے آئے تھے، پتا ہی نہیں چلا، تم سے ملنا چاہ رہے تھے۔ تمہاری امدادی سرگرمیوں میں حصہ لینا چاہتے ہیں۔'' پروفیسر انوار مسکرا دیئے تو احمر اور عثمان کا سر پشیمانی سے جھک گیا۔ وہ بمشکل بول پائے۔ ''جی......!''

''ارے! نیکی اور پوچھ پوچھ...... کیوں نہیں...... ضرور!'' نرگس کے جواب پر پروفیسر کی آنکھیں ایک بار پھر پُرنم ہو گئیں۔

اللہ اکبر...... اذان کی آواز گونج اُٹھی تو احمر اور عثمان نے سر آسمان کی طرف کر لیا، وہ سب مطمئن تھے۔

واقعی! خدا کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ احمر اور عثمان سوچتے سوچتے مسجد کی جانب بڑھ گئے تا کہ اللہ تبارک تعالیٰ کا شکر بجا لائیں۔

☆☆☆

کھوج لگائیے میں حصہ لینے والے بچوں کے نام

محمد سلیم مغل، قصور۔ عبداللہ شعیب، لاہور۔ محمد گوہر دین قادری، کاموں کے۔ ایمن اظہر، لاہور۔ ماریہ ناصر، کلور کوٹ۔ محمد عالیان لیاقت، منچن آباد۔ فائزہ رضا، گجرات۔ ام کلثوم، سیال کوٹ۔ علیان جمشید، لاہور۔ وردہ زہرہ، جھنگ۔ احمد شیراز، فاروق آباد۔ حافظ محمد ذکوان، بہاول پور۔ محمد منیب انور، شیخوپورہ۔ محمد عثمان، وزیر آباد۔ میاں محمد عبدالمنعم، فیصل آباد۔ مریم علی، فیصل آباد۔ ثمامہ سہیل، راول پنڈی۔ شاہ زیب، شعیب، گوجرانوالہ۔ لائبہ نذیر، لاہور۔ محمد مبشر شاہ، کوہاٹ۔ محمد حسنین ندیم، اٹک۔ حفصہ امتیاز، راول پنڈی۔ فروا خرم، گوجرہ۔ صباحت فاطمہ، اوکاڑہ۔ امشاج فیصل، اسلام آباد۔ محمد عثمان اکرم، گوجرانوالہ۔ فاطمہ آفرین، گوجرانوالہ۔ ربیعہ آفتاب، ایبٹ آباد۔ ہاجر ابراہیم ورک، راول پنڈی۔ صداقت علی، لاہور۔ عبدالرحمٰن احمد، لاہور۔ سیدہ فبھا فاطمہ شیرازی، کوٹ مومن۔ محمد نعمان یوسف، کنجاہ۔ زوبیہ احمد، کراچی۔ خاور اقبال، میانوالی۔ زین احمد قریشی، فیصل آباد۔ نعمان آصف، اسلام آباد۔ ولید طیب، خوشاب۔ رانا بلال احمد، بھکر۔ جویریہ سعید، راول پنڈی۔ زہرہ عاتکہ، شور کوٹ۔ حمزہ ایوب، کراچی۔ فتح محمد شارق، خوشاب۔ سید تیمور علی، خالد، جھنگ صدر۔ تحریم عائشہ خان، ساہی وال۔ انیقہ فجر ظفر قریشی، میر پور، آزاد کشمیر۔ تسنیم عبدالمجید، رلیہ جنگ۔ فجر خان، نوشہرہ۔ رمشاء عبدالصمد، لاہور۔ ہیثل راشد، راول پنڈی۔ بنت عبدالواحد، لاہور۔ صباحت فاطمہ، محمد حسان، میاں والی۔ محمد اسید، جہلم۔ یوسف قیصر، لاہور کینٹ۔ عادل کبیر، راول پنڈی۔ سیدہ نور المنتہیٰ، راول پنڈی۔ عزت مسعود، فیصل آباد۔ آمنہ سلام، اسلام آباد۔ حرا سعید شاہ، جوہر آباد۔ زوہیب خالد، میر پور۔ محمد ذیبان، بہاول پور۔ محمد صہیب شاہد، راول پنڈی۔ آمنہ شہزاد، گوجرانوالہ۔ عائزہ ندیم، لاہور۔ محمد ثوبان، بہاول پور۔ نمرہ طاہر بٹ، گجرات۔ عبدالرافع، بہاول پور۔ فضہ فاطمہ، اسلام آباد۔ محمد عثمان، کاموں کے۔ عمر فاروق، گوجرانوالہ۔ تحریم احمد، راول پنڈی۔ ندا خان، پشاور۔ حریمہ صدیقی، راول پنڈی۔ رامین رضوان، راول پنڈی۔ آمنہ رحمٰن، لاہور۔ عفیفہ مریم، چکوال۔ فرحین شہزادی، گوجرانوالہ۔ احمد محمود، راول پنڈی۔ ایشع طارق، گوجرانوالہ۔ انعم اکرم، گوجرانوالہ۔ ارفع اختر، راول پنڈی۔ رمیشہ نور، اسلام آباد۔ محمد ریان، فیصل آباد۔ عبدالمومن، بہاول پور۔ آمنہ رانا، ساہی وال۔ وجاح ماجد، قصور۔ محمد رضوان، میانوالی۔ محمد حنظلہ سعید، فیصل آباد۔ مقدس چوہدری، راول پنڈی۔ حسن احمد چوہدری، منچن آباد۔ احمد حسن قادر، لاہور۔ حافظ محمد خبیب منیر، لاہور۔ عابد رحمان، لاہور۔ زینب ناصر، فیصل آباد۔ حاجی منور حسین مغل، گوجرانوالہ۔ عالیان علی، لاہور۔ سید محمد منصور، بہاول پور۔ محمد عبداللہ، لاہور۔

گلاب خان سولنگی

جذبہ

"مدثر بیٹے! درزی سے نئے کپڑے تو لے آؤ تاکہ کل عید پر پہن سکو۔"

"جی امی ابھی گیا۔" مدثر نے امی سے کچھ رقم لی تاکہ درزی کو سلائی دے کر اپنا نیا سوٹ لے آئے اور درزی کی دکان کی طرف روانہ ہو گیا۔

مدثر اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ نہایت ہی لائق، ذہین اور ہونہار شاگرد تھا۔ مدثر پانچویں جماعت کا طالب علم تھا اور والدین اور اُستادوں کا فرماں بردار بھی تھا۔ مدثر نے اپنی زندگی کے کچھ اُصول بنا رکھے تھے۔ وہ کھیل کے وقت کھیل اور پڑھائی کے وقت پڑھائی کرتا تھا اور اس نے دوست بھی اچھے اور نیک بنا رکھے تھے۔ مدثر اپنے دوستوں کے ہمراہ درزی کی دکان پر پہنچا، درزی نے اس سے سلائی وصول کی اور سوٹ تھما دیا۔ مدثر کے دوستوں نے اس کے نئے سوٹ کی بہت تعریف کی اور کہا کہ کل عید والے دن تم پر بہت اچھا جچے گا۔ مدثر اپنے نئے سوٹ کی تعریف سن کر بہت خوش ہوا اور کہا۔

"بھئی اچھا کیوں نہ ہو، پچھلے ہفتے ہی تو ابا کراچی سے خرید کر لایا تھا اور آپ لوگوں کو پتا ہے میں نے اپنی جیب خرچ سے پیسے بچا بچا کر ابا کو دیئے تھے۔ وہ مزدوری کرتے ہیں ناں! اس لیے میں نے اس پر زیادہ بوجھ ڈالنے نہیں دیا۔"

وہ سارے دوست باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے کہ اچانک انہوں نے ایک اعلان سنا جو کہ گاؤں کے ایک اسکول میں سے آ رہا تھا۔ "گاؤں والو! قحط سالی کی وجہ سے تھر پار کر سے کچھ لوگ، بوڑھے اور بچے ہمارے گاؤں کے اسکول میں آپ کی امداد کے منتظر ہیں، لہٰذا سب گاؤں والوں سے اپیل کی جاتی ہے کہ حسب توفیق ان غریب اور لاچار لوگوں کی مدد کیجیے اور ثواب دارین حاصل کیجیے۔"

مدثر اور اس کے دوستوں نے جیسے ہی اعلان سنا تو دبے پاؤں وہ اسکول کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں جا کر انہوں نے دیکھا کہ ہر طرف چیخ پکار ہے، بھوک سے بلکتے ہوئے چھوٹے بچے اپنی اپنی ماؤں کی گود میں رو رہے ہیں۔ لاچار و مجبور مائیں حسرت و بے بسی سے اِدھر اُدھر تک رہی ہیں تاکہ کہیں سے اللہ کا کوئی نیک بندہ ان کی مدد کو آن پہنچے۔ سامنے کچھ بوڑھے لوگ اپنے لیے خیمہ لگا رہے ہیں۔ مدثر اور اس کے دوستوں نے اپنے تھری بھائیوں کی یہ حالت دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے۔ وہاں پر انہوں نے ایک اور تماشا بھی دیکھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے کچھ صحافی اپنی اپنی خدمات سرانجام دے رہے تھے کہ کہیں سے حکومت کے کچھ سیاسی لوگ نمودار ہوئے اور وہاں پر موجود قحط سالی سے متاثر تھری لوگوں کو جھوٹے دلاسے اور تسلیاں دیتے رہے اور میڈیا کے سامنے کچھ

بیانات دے کر اور فوٹو اتروا کر چلتے بنے۔

مدثر سے ان بچوں کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی، اس لیے اس نے آگے بڑھ کر اپنا نیا سوٹ اور کچھ رقم جو اس کے پاس موجود تھی، اپنے تھری بھائیوں کے حوالے کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سارے دوستوں نے بھی اپنی اپنی جیب خرچ کے پیسے ان غریب بچوں کے حوالے کر دیئے اور بچوں کا یہ جذبہ دیکھ کر وہاں پر موجود سب لوگوں نے بھی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق ان کی امداد کی۔ مدثر نے دیکھا کہ کچھ لوگ کھانے پینے کا سامان اور بچوں کے لیے دودھ لے کر آ رہے ہیں تو وہ فوراً دوڑا اور ان سے دودھ لے کر جلدی جلدی بچوں کی ماؤں کے حوالے کیا۔ جب معصوم بچوں کو دودھ ملا تو وہ خوشی سے کھل اُٹھے۔ انہیں خوش دیکھ کر ان کے ماؤں کی خوشی اور مسکراہٹ قابلِ دید تھی۔ بچوں نے دودھ پیا تو وہ خوش ہو کر مدثر اور اس کے دوستوں کی طرف دیکھنے لگے۔ شاید اپنی معصوم زبان میں ان کا شکریہ ادا کر رہے ہوں گے۔

مدثر اور اس کے دوستوں نے پورے گاؤں کا چکر لگایا اور گھر گھر جا کر قحط متاثرین کے لیے چندہ اور کچھ کھانے پینے کا سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا، حالاں کہ مدثر کے گاؤں کے اکثر لوگ غربت کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن مدثر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سب سے زیادہ امداد دینے والے وہی غریب لوگ تھے۔ مدثر نے غریب گاؤں والے لوگوں کے جذبے کو سلام کیا۔

شام کو جب وہ خالی ہاتھ آیا تو اس کی امی نے پوچھا۔

"بیٹے! درزی نے کپڑے سلائی نہیں کیے، کیا؟"

"امی! اگر کوئی ضرورت مند ہمیں نظر آئے تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

مدثر کے اس سوال پر وہ چونک سی گئی۔ "بیٹا! اگر کوئی ضرورت مند نظر آئے تو فوراً اس کی مدد کرنی چاہیے۔" مدثر نے کچھ سوچ کر پھر کہا۔ "امی! اگر عید پُرانے کپڑوں میں گزاری جائے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا؟" مدثر کے سوال پر پھر وہ چونک گئی۔

"ارے بیٹا، عید تو ہو جائے گی مگر کیا بات ہے جو آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو؟"

"نہیں امی! ایسی بات نہیں ہے، دراصل ہمارے گاؤں کے اسکول میں تھر سے کچھ غریب اور نادار بچے آئے ہوئے ہیں تو میں نے بھی اپنا حصہ ڈالا اور اپنا نیا سوٹ وہاں پر موجود ایک غریب بچے کو دے دیا اور اپنی جیب خرچ بھی۔ امی آپ نے ہی تو سکھایا ہے کہ ہمیں غریب اور مجبور لوگوں کی مدد کرنی چاہیے، اس سے اللہ تعالیٰ خوش ہوگا۔ میں نے بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ان غریب بچوں کی مدد کی۔ امی اب آپ ہی بتائیں کہ میں نے کیا غلط کیا؟"

مدثر کی امی کی آنکھ بھر آئی اور اس نے اپنے لعل کو سینے سے لگایا اور کہا۔ "نہیں بیٹے! آپ نے بالکل صحیح کیا۔ مجھے فخر ہے آپ پر، آپ نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا۔ بے شک آپ ابھی چھوٹے ہیں لیکن آپ کا جذبہ بڑا ہے۔ کاش اس ملک کے حکمران اور دولت مند اگر ایک بھی بچے کی امداد آپ کے جذبے کے مطابق کریں تو اس ملک میں کوئی بھی غریب بچہ بھوکا نہیں سوئے گا۔ بیٹے! آپ نے اپنے حصے کا فرض ادا کر دیا۔ مجھے امید ہے کہ آپ بڑے ہو کر اس ملک کا نام ضرور روشن کریں گے..."

امی کی بات سن کر مدثر نے کہا۔ "آمین۔"

☆☆☆

یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجیے اور شاباش لیجیے۔

ابوالعلا معرّی گوشت نہ کھاتا تھا

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معرّی
پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات

اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اسے بھیجا
شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات

یہ خوانِ تر و تازہ معرّی نے جو دیکھا
کہنے لگا وہ صاحبِ غفران [1] و لزومات [2]

اے مرغکِ بیچارہ، ذرا یہ تو بتا تو
تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات؟ [3]

افسوس، صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات!

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی [4] کی سزا مرگِ مفاجات! [5]

نظم: بالِ جبریل

ابوالعلا معرّی

کہتے ہیں کہ ابوالعلا معرّی گوشت بالکل نہ کھاتا تھا اور صرف پھل پھول کھا کر گزر اوقات کرتا تھا۔ اس کے ایک دوست نے بھنا ہوا تیتر اس کے پاس بھیج دیا کہ شاید کھا لے اور اسی تدبیر سے وہ چالاک آدمی اپنی قسم توڑ دے اور گوشت کھانے لگے۔ ابوالعلا معرّی نے جو یہ لذیذ اور تر و تازہ کھانا دیکھا تو وہ بولا۔

''اے غریب اور مسکین پرندے! ذرا یہ تو بتا کہ تیرا وہ کیا گناہ تھا جس کی تجھے یہ سزا ملی ہے کہ پہلے تجھے ذبح کیا گیا اور پھر آگ پر بھونا گیا؟ افسوس، تجھ پر سو بار افسوس کہ تو شاہین نہ بنا اور تیری آنکھ نے فطرت کے اشاروں کو نہ سمجھا۔ یہ اشارے تو بڑے صاف اور واضح ہیں۔ تقدیر کے قاضی نے تو ازل دن ہی سے یہ فتویٰ اور فیصلہ دے رکھا ہے کہ کمزوری کے جرم کی سزا اچانک اور ناگہانی موت کے سوا کچھ نہیں۔ اس دُنیا میں جو کمزور اور بے قوت ہیں، وہ اسی طرح دوسروں کا شکار ہوتے رہیں گے۔ اے بدقسمت تیتر! اگر تو شاہین بنا ہوتا، اگر تو اپنے اندر شاہین کی سی قوت پیدا کر کے بلندیوں پر پرواز کرتا رہتا تو پھر کسی شکاری کا تیر تجھ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔''

علامہ اقبالؒ نے اس نظم میں عربی کے مشہور نابینا شاعر ابوالعلا معرّی کی زندگی کا ایک مشہور واقعہ بیان کیا ہے۔ ابوالعلا معرّی کا اصل نام احمد بن عبداللہ بن سلیمان تھا اور وہ جنوبی عرب کے قبیلہ تنوخ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس قبیلے کے کچھ لوگ اپنے وطن سے ہجرت کر کے شام کے ایک مقام معرۃ النعمان میں جا بسے تھے۔ ابوالعلا وہیں ۳۶۳ ہجری (۹۷۳ عیسوی) میں پیدا ہوا اور اسی وجہ سے معرّی کہلایا۔ چھ سات سال کی عمر میں اسے چیچک نکلی اور اس کے نتیجے میں اس کی بینائی جاتی رہی۔ اس کا حافظہ بے حد قوی تھا۔ جو کچھ سن لیتا، وہ فوراً اسے یاد ہو جاتا تھا۔ پینتیس سال کی عمر میں وہ بغداد گیا اور کوئی دو سال تک وہاں رہا۔ ایک بار بغداد کے ایک مشہور عالم سے کسی معاملے میں بحث چھڑ گئی۔ معرّی نے جب اپنی باتوں سے اسے لاجواب کر دیا تو وہ عالم پریشان ہو کر کہنے لگا۔ ''یہ کون کتا ہے؟''

ابوالعلا معرّی نے جواب دیا۔ ''یہ وہ کتا ہے جسے کتے کے ستر نام یاد ہیں۔''

بغداد میں دو سال گزارنے کے بعد ابوالعلا واپس چلا آیا اور پھر گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی اور پھر کبھی اپنے گھر سے باہر نہ نکلا۔ اس نے چھیاسی برس کی عمر پائی اور ۴۴۹ ہجری میں فوت ہوا۔ کہتے ہیں کہ اس نے چالیس اکتالیس سال کی عمر میں گوشت کھانا بالکل ترک کر دیا تھا اور زندگی کے آخری پینتالیس سالوں میں سبزیوں اور پھلوں کے سوا اور کچھ نہ کھایا۔

علامہ اقبالؒ نے ابوالعلا معرّی کی زندگی کا یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے ہمیں خود معرّی کی زبان سے زندگی کی یہ اہم ترین حقیقت بتائی ہے کہ اس دُنیا میں قوت و طاقت کی فرماں روائی ہے۔ یہاں کمزور اور ضعیف کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ قوت اور ہمت ہی زندگی کے اصل سامان ہیں۔ جو قوت اور ہمت سے محروم ہیں، وہ اسی طرح دوسروں کے شکار ہوتے رہتے ہیں۔ تیتر ضعیف، کمزور اور قوت و ہمت سے محروم تھا، اس کی سزا اسے یہ ملی کہ پہلے اسے ذبح کیا گیا اور پھر آگ پر بھونا گیا۔ اگر وہ شاہین ہوتا، اگر وہ اپنے اندر شاہین کی سی قوت و ہمت کر کے آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرتا رہتا تو اس دردناک انجام سے دوچار نہ ہوتا۔

1. غفران: رسالۃ الغفران معرّی کی مشہور کتاب کا نام ہے۔
2. لزومات: اس کے قصائد کا مجموعہ ہے۔
3. مکافات: عوض، بدلہ
4. جرمِ ضعیفی: کمزوری کا جرم
5. مرگِ مفاجات: اتفاقی یا ناگہانی موت

ایک دوسرے کا خیال

عمیر محمود، اوکاڑہ

کسی گاؤں میں ایک بوڑھا کسان رہتا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ جب کسان بہت زیادہ بوڑھا ہو گیا تو اس نے سوچا کہ اپنے بیٹوں کو کھیتی باڑی کا کام سکھا دوں۔ اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو کھیتی باڑی کا کام سکھا دیا۔ پھر اسی طرح دن گزرتے گئے۔ ایک دن کسان بیمار ہو کر چارپائی پر پڑ گیا۔ چند دن تک تو کسان بیمار پڑا رہا لیکن تھوڑے دنوں بعد ہی وفات پا گیا۔ مرتے مرتے اس نے اپنے بیٹوں کو ایک ہی نصیحت کی تھی کہ بیٹا ہر حال میں ایک دوسرے کا خیال رکھنا۔ کسان کی وفات کے بعد جب اس کی زمین کا حصہ نکالا گیا تو دونوں بھائیوں کو برابر زمین ملی۔ بڑا بھائی جو کہ گاؤں کا چوہدری بھی تھا، اس نے سوچا کہ یہ زمین تو کافی ہے، اسی سے آرام سے گزر بسر ہو جائے گی لیکن اس کا یہ خیال چند سالوں بعد غلط ثابت ہوا۔ بڑے بھائی نے اپنا گزارا کرنے کے لیے تھوڑی تھوڑی کر کے ساری زمین بیچ ڈالی اور اس کے بعد غربت کی زندگی گزارنے لگا جب کہ اس کے چھوٹے بھائی نے محنت کر کے کچھ اور زمین بھی خرید لی۔ بڑا بھائی گاؤں کا معزز آدمی تھا۔ اس لیے اس نے اپنی غربت کا ذکر کسی سے نہ کیا لیکن اس کے چھوٹے بھائی کو پتا چل گیا کہ اس کا بڑا بھائی غربت کی حالت میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس نے سوچا مجھے تو یہاں کوئی جانتا ہی نہیں ہے لیکن بڑے بھائی کو سب ہی جانتے ہیں اور عزت کرتے ہیں، کیوں نہ میں اپنی آدھی زمین اپنے بھائی کو دے دوں۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے اپنی آدھی زمین اپنے بڑے بھائی کو دے دی۔ پہلے تو بڑے بھائی نے انکار کیا لیکن چھوٹے کے زیادہ اصرار کرنے پر بڑا بھائی بھی مان گیا۔ چند دنوں بعد زمین میں بوائی کا موسم آ گیا۔ دونوں بھائیوں نے خوب محنت سے بوائی کی۔ ان کی اس محنت کے نتیجے میں ان کی فصل بھی بڑی شان دار ہوئی۔ جب فصل آ گئی تو کھیت کے اندر ہی دو ڈھیریاں کر لی گئیں، ایک اناج کی ڈھیری بڑے بھائی کی تھی اور ایک اناج کی ڈھیری چھوٹے بھائی کی تھی۔ چھوٹے بھائی نے بڑے کو کہا کہ ہم رات کے وقت اناج کی ڈھیریاں اکٹھی کریں گے کیوں کہ دن میں بہت زیادہ گرمی ہوتی ہے۔ بڑے بھائی نے کہا کہ ٹھیک ہے جیسا تم کہتے ہو کر لیتے ہیں۔ رات کے وقت دونوں بھائیوں نے بوریوں میں اناج بھرنا شروع کر دیا۔ جب ایک بھائی بوری گھر چھوڑنے جاتا تو دوسرا اس وقت اناج کے پاس ہی موجود رہتا تھا۔ جب بڑا بھائی اپنی بوری بھر رہا تھا تو چھوٹا بھائی اس وقت موجود نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ میں تو بڑا ہوں کہیں سے ادھار لے کر گزارا کر لوں گا مگر چھوٹا بے چارا کیا کرے گا۔ اس نے یہ سوچ کر اپنے اناج میں سے کچھ اپنے بھائی کی ڈھیری میں ڈال دیا۔ جب چھوٹا آیا تو اس نے بھی اسی طرح سوچا کہ میرا بھائی تو گاؤں کا معزز آدمی ہے، اگر سال بھر کا اناج کم پڑ گیا تو کیا کرے گا۔ میں تو کسی سے قرض لے کر گزارا کر لوں گا مگر میرا بھائی اگر کسی سے قرض لے گا تو اس کی عزت خراب ہو گی۔ اس نے یہ سوچ کر تھوڑا سا اناج اُٹھا کر اپنے بھائی کی ڈھیری میں ڈال دیا۔ دونوں بھائی اسی طرح ساری رات بوریاں بھر بھر کے ڈھوتے رہے مگر اناج ختم نہ ہوا یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ وہاں پر ایک بوڑھا آدمی بھی بیٹھا ہوا تھا جس نے رات کے وقت ان کی یہ تمام کارروائی دیکھ لی تھی۔ وہ بزرگ ان دونوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور ان کو جا کر شاباش دی اور کہا کہ تم جس طریقے سے رات کے وقت بوریاں اکٹھی کرتے رہے ہو، اگر تم اسی طرح یہ بوریاں اکٹھی کرتے رہتے تو یہ اناج ساری زندگی تک ختم نہ ہوتا۔

پہلا انعام: 195 روپے کی کتب

عظیم کتاب

خولہ اصغر، ننددوال

"احمد بیٹا وضو کر کے قرآن مجید کو پکڑتے ہیں۔" امی نے برتن دھوتے ہوئے اسے کہا لیکن احمد خاموشی سے نکل گیا۔

احمد ایک اچھا بچہ تھا لیکن اس میں صرف ایک خامی تھی کہ وہ قرآن مجید کو وضو کیے بغیر ہی پکڑ لیتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی جب وہ پارے کا سبق پڑھنے لگا تو اس نے قرآن مجید کو وضو کیے بغیر پکڑ لیا۔ امی اس کی عادت سے بہت خفا ہوئیں مگر جب وہ اس

کی اچھی عادتوں کو دیکھتیں تو وہ چپ ہو جاتیں مگر آج ان سے رہا نہ گیا۔ جب احمد پارے کا سبق پڑھ کر گھر آیا تو امی نے اسے دو، تین تھپڑ رسید کیے کہ میں تمہیں ہمیشہ کہتی ہوں کہ قرآن مجید کو وضو کیے بغیر مت پکڑا کرو مگر تم ہو کہ سنتے ہی نہیں۔ دوسرے دن جب وہ پارے کا سبق پڑھنے گیا تو اس نے آج بھی وضو نہیں کیا۔ آج تو اس کی امی بہت پریشان ہوئیں انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ آج اس کو پیار سے سمجھاؤں گی۔ جوں ہی احمد گھر میں داخل ہوا، امی جان نے اس سے کہا: ''بیٹا! کھانا تیار ہے، آ کر کھانا کھا لو۔'' احمد نے فوراً ہاتھ دھوئے اور بسم اللہ پڑھ کر کھانا کھانے لگا۔ کھانا کھاتے ہوئے امی جان نے بات کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا! تم اتنے اچھے اور تمیزدار بچے ہو لیکن تم وضو کیے بغیر قرآن مجید کو پکڑ لیتے ہو، قرآن مجید مسلمانوں کی عظیم کتاب ہے۔ یہ حضرت محمدؐ پر نازل ہوئی اور اس کی عظمت کا خیال نہ رکھنا، بہت سخت گناہ ہے۔'' امی جان سانس لینے کے لیے رُکیں۔ انہوں نے احمد کی طرف دیکھا، دو آنسو اس کے نرم نرم گالوں پر لڑھک گئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے کہا۔ ''امی جان! مجھے معاف کر دیں۔'' ''میں نے تو تمہیں معاف کر دیا مگر تمہیں معافی اللہ تعالیٰ سے مانگنی چاہیے۔'' فوراً ہی احمد کے ننھے ہاتھ اٹھتے ہوئے دکھائی دیے اور اس نے اپنے رب سے معافی مانگ لی۔

دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب

نہیں!...... کوئی ہے

کشف طاہر، لاہور

عثمان کا ناصر کے ساتھ دوستانہ تعلق تو بہت پُرانا تھا مگر پھر بھی عثمان ناصر کے ہر کام سے فوراً اتفاق نہیں کرتا تھا کیوں کہ ناصر کے کچھ کام انتہائی خطرناک ہوا کرتے تھے۔ آج بھی کچھ یوں ہی ہونے والا تھا۔ نمازِ عشاء کے بعد عثمان کے گھر کی گھنٹی بجی۔ دروازہ کھلنے پر معلوم ہوا کہ ناصر بغیر کسی تاخیر کے عثمان کو کہیں لے کر جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ عثمان کے والد نے اسے بتایا کہ ''آپ کا دوست دروازے پر آپ کا منتظر کھڑا ہے۔'' عثمان فوراً دروازے پر پہنچا۔ ''جی...... ناصر! کیا ارادے ہیں آج آپ کے؟'' عثمان نے پوچھا۔ ''بس...... بس میرے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار ہو جاؤ۔'' ناصر نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ نہ جانے وہ عثمان جو بہت غور و فکر کے بعد قدم اُٹھاتا تھا آج بغیر سوچے سمجھے ناصر کے ساتھ سوار ہو گیا۔ چند لمحوں بعد موٹر سائیکل انتہائی تیز رفتاری میں بھاگے جا رہی تھی۔ ''ناصر بھائی! کہاں کا ارادہ ہے؟'' عثمان گویا ہوا۔ ''بس! ہمیں ایک کام کے لیے ساتھ والے گاؤں جانا ہے۔'' ناصر نے تیزی سے جواب دیا۔ ناصر نے موٹر سائیکل گاؤں سے ہٹ کر ایک گھر سے ذرا فاصلے پر روک دیا اور فوراً بولا: ''چلو عثمان! میرے ساتھ۔'' بجلی بند تھی، پورے علاقے میں سناٹا چھایا ہوا تھا کہ یکایک ناصر نے اپنے سامنے والے گھر کی دیوار پھلانگی اور عثمان کو باہر روک دیا۔ ''میں آ رہا ہوں۔'' ناصر یہ کہتے کہتے اندر گھس گیا اور کچھ دیر بعد نمودار ہوا اور کہنے لگا: ''عثمان! دراصل یہ گھر والے گھر میں موجود نہیں، مجھے علم ہوا تو میں نے سوچا کہ ان کا قیمتی سامان لوٹتے ہیں۔'' اور ساتھ ہی ایک بھاری بھرکم صندوق عثمان کو تھمانے لگا، لیکن عثمان پر گویا ناصر کے الفاظ بجلی بن کر گرے جیسے اس کے جسم سے روح نکل گئی ہو۔ عثمان لڑکھڑائی ٹانگوں اور کپکپاتے جسم کے ساتھ اسے دیکھنے لگا۔ ناصر، عثمان سے مخاطب ہوا: ''جلدی کرو! اس وقت ہمیں کوئی نہیں دیکھ رہا۔'' ''نن...... نن...... نن...... نہیں! کوئی ہے۔'' عثمان بولا۔ ''جلدی کرو سے تمہارا کیا مطلب! اس وقت ہمیں اللہ دیکھ رہا ہے۔'' عثمان نے ناصر کو گھورتے ہوئے کہا۔ ناصر سکتے میں آ گیا۔ صندوق اس کے ہاتھوں سے گر گیا اور وہ عثمان کے ساتھ لپٹ کر رونے لگا اور بولا: ''دوست! آج تو تم نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ کہ مجھے ایک گناہِ کبیرہ سے بچا لیا۔ میں ہر بُرے کام سے جو بُرا ہے توبہ کرتا ہوں کیوں کہ کوئی دیکھے نہ دیکھے اللہ تعالیٰ تو ہمیں دیکھ رہا ہوتا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے دونوں موٹر سائیکل پر سوار ہوئے اور واپس چلے گئے۔

تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب

بُرائی کا بدلہ اچھائی میں

آمنہ بنت حبیب الرحمٰن، کراچی

عمار ایک بہت ہی بدتمیز لڑکا تھا۔ ماں باپ کے بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے وہ بہت بگڑ گیا تھا اور اسی وجہ سے پڑھائی سے بھی اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ وہ ہر وقت باہر کھیلتا رہتا یا کبھی کسی کو تنگ کرتا رہتا۔ اس کی ان بُری عادتوں کی وجہ سے اسے کوئی بھی اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ اس کے پڑوس میں ایک ہفتہ پہلے ہی ایک نیا لڑکا آیا تھا۔ اس کا نام احمد تھا۔ وہ اپنے نام ہی کی طرح ایک اچھا لڑکا تھا۔ احمد ایک بہت ہی نیک، سمجھ دار اور ماں باپ کا اچھا اور فرماں بردار بچہ تھا۔ اس کی اچھی عادتوں کی وجہ سے وہ ہر پڑوسی کی آنکھ کا تارا بن گیا تھا۔ جب احمد کو عمار کی بُری عادتوں کا پتا چلا تو اسے بہت

دکھ ہوا۔ عمار نے جب دیکھا کہ احمد سب پڑوسیوں کی نظر میں اچھا بن گیا ہے تو اس کے اندر احمد کے لیے حسد اور جلن پیدا ہونے لگا اور اس نے کئی شریر لڑکوں کے ساتھ مل کر احمد کو تنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ احمد اپنی امی کے کام سے باہر نکلا ہی تھا کہ عمار نے اس کی سائیکل کا ٹائر پنکچر کر دیا تاکہ احمد اپنی امی کا کام نہ کر سکے اور اسے اپنی امی سے ڈانٹ کھانی پڑے۔ یہ کام کر کے عمار فوراً دوڑ پڑا تاکہ احمد کو شک نہ ہو۔ اتنے میں عمار نے سوچا کہ چلو اپنے دوست کے گھر چلیں۔ دراصل عمار کو ایک کام آن پڑا۔ جب اس نے اپنی سائیکل نکالی تو اس نے دیکھا کہ اس کی سائیکل کا ٹائر پنکچر ہے۔ وہ حیران ہو گیا کہ میری سائیکل کا ٹائر کیسے پنکچر ہوا۔ دراصل جب عمار احمد کی سائیکل کا ٹائر پنکچر کر رہا تھا تو اتفاق سے احمد اور عمار کی سائیکل ایک ہی طرح کی تھیں اور اس نے اپنی سائیکل کا ٹائر ہی پنکچر کر دیا۔ اتنے میں احمد اپنی امی کا سامان لے کر آ رہا تھا۔ اس نے عمار کو کھڑا دیکھا تو اس سے پوچھا: ''کیا بات ہے عمار؟ اتنے پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہو؟'' عمار نے اسے مجبوراً سارا ماجرا سنایا تو احمد نے مسکرا کر کہا: ''بھلا اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ یہ لو میری سائیکل اور اب جاؤ۔'' عمار اپنی غلطی پر پشیمان ہوا اور احمد سے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت دوبارہ کبھی نہیں کرے گا اور پھر وہ دونوں دوست بن گئے۔ عمار ایک نیک اور شریف بالکل احمد کی طرح کا بچہ بن گیا۔

چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب

ایمان داری کا صلہ

کامران اللہ خٹک، کرک

میں گیارہویں جماعت کا طالب علم ہوں۔ پچھلے دنوں ہمارے سہ ماہی امتحانات اختتام پذیر ہوئے۔ اسی سے متعلق ایک دل چسپ واقعہ آپ کو بھی سناتا ہوں۔

ہمارے اسکول کا یہ طریقہ کار تھا کہ جو بھی ٹیچر پرچہ چیک کرتا تو وہ ہر ایک لڑکے کو پرچہ دیتے تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے۔ میں ایک پوزیشن لینے والا طالب علم تھا لیکن اس دفعہ ڈیٹ شیٹ غلط لکھنے کی وجہ سے میں نے فزکس کی بجائے کیمسٹری کے لیے تیاری کی تھی جس کی وجہ سے میں ہمت ہار بیٹھا تھا لیکن باقاعدہ مطالعے کی وجہ سے میں نے پیپر میں اوسط نمبر حاصل کیے۔ چونکہ باقی پرچوں میں اچھے نمبر آئے تھے اس لیے میں پوزیشن کے لیے ایک دفعہ پھر پُرامید ہو گیا۔

اب صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ صرف ایک پیپر ''اُردو'' کا رزلٹ باقی تھا اور باقی پانچ مضامین میں چوتھی پوزیشن پر تھا۔ تیسرے نمبر کا لڑکا عدنان صرف تین نمبروں کے ساتھ مجھ سے آگے تھا، اس لیے میں مسلسل دعائیں کیے جا رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح میرے چار پانچ نمبر زیادہ آ جائیں اور میں پوزیشن حاصل کر لوں۔ انتظار کے لمحات ختم ہو گئے، آخر کار اُردو کا پیریڈ بھی آ گیا۔ سرفدا نے مجھے سسپنس میں رکھنے کے لیے کہا: ''آپ کا پیپر تو اچھا نہیں تھا۔''

میں اور بھی مایوس ہو گیا لیکن یہ کیا؟ جوں ہی سرفدا نے مجھے پیپر تھمایا، میں عدنان سے چھ نمبر آگے..... مطلب میں نے تیسری پوزیشن حاصل کر لی۔ میری خوشی دیدنی تھی۔ پھر سرفدا نے کہا: ''سارے لڑکے اپنے اپنے پرچے دیکھ لو، جس کسی کو شک و شبہ ہو تو پوچھ سکتے ہیں۔'' جب میں نے یہ سن لیا تو اپنے مارکس گن لیے۔ مجھے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا کیوں کہ مجھے غلطی سے چار نمبر زیادہ ملے تھے۔ اگر یہی چار نمبر جاتے تو میری پوزیشن بھی جاتی۔ اس لیے میں نے کئی بار گن لیے لیکن چار نمبر زائد تھے۔ ضمیر سچ اور ایمان داری سے کام لینے کا کہہ رہا تھا لیکن دل کہہ رہا تھا ''ما درچہ خیالم فلک درچہ خیالم'' (میں کس خیال میں ہوں اور آسمان کس خیال میں ہے۔) لہٰذا چپکے سے پرچہ بستے میں ڈال دیا تاکہ کوئی دیکھ نہ لے اور بھانڈا پھوٹ نہ جائے۔

گھر آ گیا لیکن دلی تسلی ندارد تھی۔ عشاء کو مولوی صاحب نے فرمایا: ''اے ابن آدم! ایک تیری چاہت ہے اور ایک میری چاہت ہے، اگر تو نے کر دیا جو میری چاہت ہے تو تجھے وہ بھی دوں گا جو تیری چاہت ہے اور اگر تو نے کر دیا وہ جو تیری چاہت ہے تو ہو گا وہی جو میری چاہت ہے اور تھکا دوں گا تجھے اس میں جو تیری چاہت ہے۔'' بس میرے لیے یہی کافی تھا۔ میں کل سیدھا اسکول پہنچ کر سرفدا سے ملا اور انہیں ساری حقیقت بتا دی۔ وہ بہت خوش ہوئے اور مجھے اعزازی طور پر تیسری پوزیشن بھی دی گئی۔ اب میں بہت خوش تھا کیوں کہ دل بھی مطمئن اور پوزیشن بھی ہاتھ میں!!!

پیارے بچو! اس کہانی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہمیں اوّل تو جو کچھ اُستاد سکھائے وہ صحیح طریقے سے نوٹ کریں تاکہ بعد میں بڑی غلطی کا باعث نہ بنے، دوئم ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ مطلب ناامید نہیں ہونا چاہیے، سوئم ہمیشہ اللہ کی چاہت کو فوقیت دینی چاہیے۔

پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب

د	خ	ٹ	ژ	س	ل	ب	ض	ح	ڈ
ف	ل	ی	ء	ج	ق	ش	ے	س	ب
ک	ی	ا	ح	م	د	ی	پ	ظ	ی
ث	ل	ز	ش	ط	گ	ر	ڈ	ح	س
م	ا	م	و	ن	ق	د	ا	ص	ا
ح	غ	ذ	ص	ع	ب	ڑ	س	ط	ح
ا	ہ	م	ب	ی	ن	ل	ر	ق	م
ب	ث	ف	ا	ر	ک	ء	ا	و	ت
ص	گ	ظ	ص	ف	س	و	ج	ع	ن
م	چ	ر	ی	ذ	ن	غ	ش	ض	خ

آپ نے حروف ملا کر اسماء مبارک تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن الفاظ کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

احمد، حسیب، مصباح، صادق، مبین، سراج، نذیر، خلیل، بشیر، مامون

کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

ارشد اور زاہد ایک بہت بڑا اسٹور چلاتے تھے۔ وہاں انہوں نے تقریباً دس بارہ ملازم بھی رکھے ہوئے تھے۔ ارشد صاحب اسٹور بند کرتے وقت سویپر سے صفائی کروا کر جاتے تھے۔ تمام ملازمین مل کر اسٹور کو بند کرتے تھے۔ ایک دن یوں ہوا کہ ارشد صاحب نے اسٹور کھولا تو کیش باکس میں دو لاکھ روپے کی رقم غائب تھی۔ وہ بہت ٹپٹائے۔ اچانک ان کے پاؤں کے نیچے ایک چیز آ گئی۔ جھک کر دیکھا تو یہ چشمہ تھا۔ انہوں نے اس چشمے کو غور سے دیکھا اور ایک طرف رکھ دیا۔ اسی وقت انہوں نے پولیس کو اطلاع دی۔ پولیس نے آ کر تفتیش شروع کر دی۔ تمام ملازمین سے پوچھ گچھ کی۔ انہیں ایک ملازم پر شک گزرا۔ پولیس آفیسر نے ارشد صاحب سے بھی کچھ سوالات کیے۔ ارشد نے ایک غیر معمولی بات نوٹ کی وہ چشمہ تھا جو زمین پر پڑا تھا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ آخری بار اسٹور کی صفائی کرواتے وقت زمین پر کوئی چیز نہ تھی۔ پولیس آفیسر نے ایک ملازم کو مجرم قرار دے دیا۔ انہیں ایک ثبوت مل گیا تھا۔ انہوں نے اسی ملازم سے پوچھا کہ تم چشمہ استعمال کرتے ہو۔ ملازم نے کہا کہ وہ تو چشمہ لگاتا ہی نہیں۔

پیارے بچو! آپ بتایئے کہ پولیس آفیسر کو کیسے معلوم ہوا کہ اصل مجرم یہی ملازم ہی ہے۔
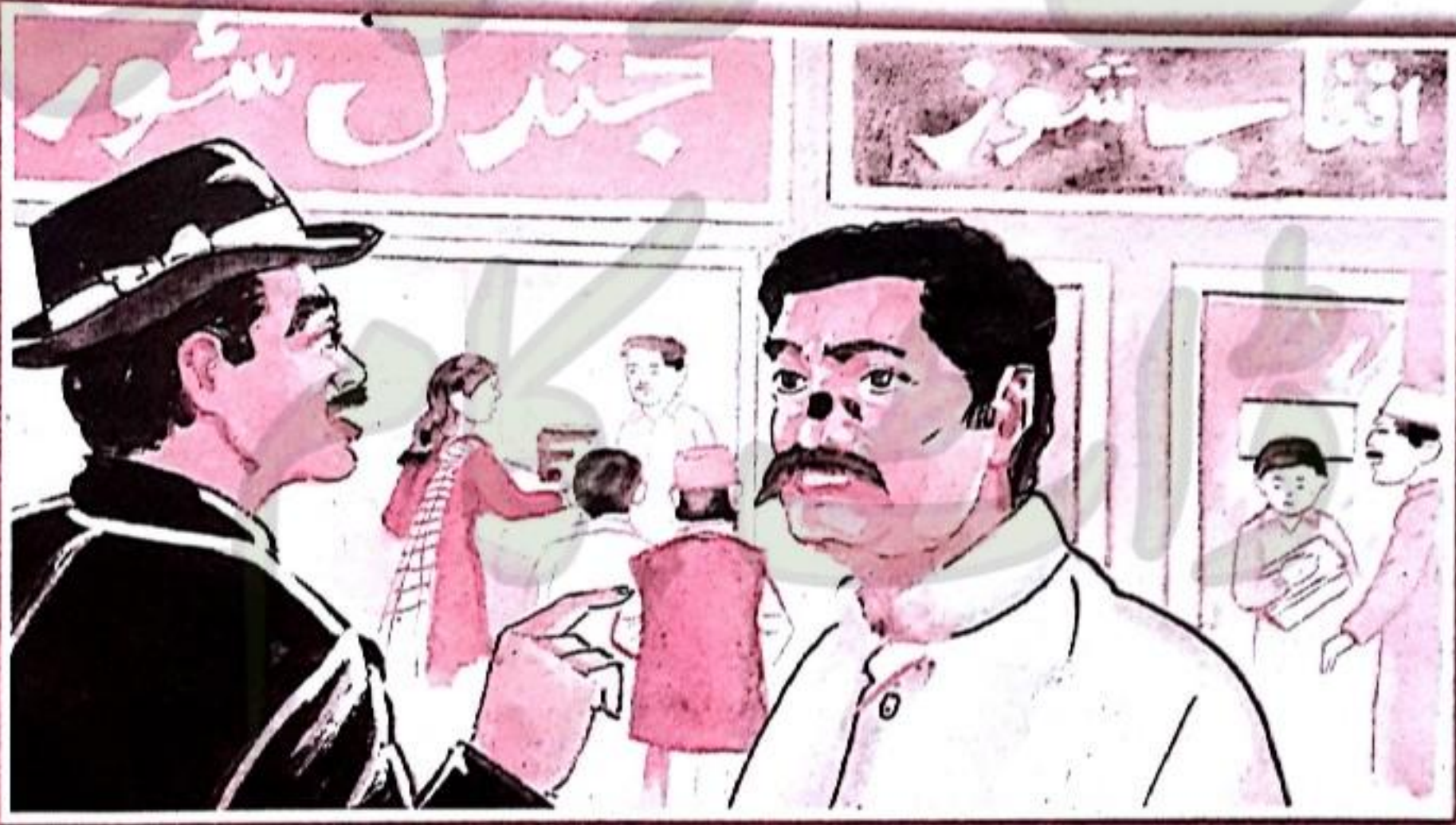
دسمبر 2014ء میں شائع ہونے والے ''کھوج لگائیے'' کا صحیح جواب یہ ہے: مالٹا، آلو، سیب، بینگن، توری، پالک، گوبھی، مٹر

دسمبر 2014ء کے کھوج لگائیے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

1- وشمہ خان، لاہور 2- ماہ نور افضل، گوجرانوالہ
3- مدثر غفار، پاک پتن 4- عاصم جمیل، اسلام آباد
5- اکمل افضل، لاہور

اتوار کا دن تھا، موسم بھی خوش گوار تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ چار دوست ندیم، حسن، نواز اور عمر گراؤنڈ میں کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے۔ یہ چاروں دوست ہر اتوار کو گراؤنڈ میں کرکٹ کھیلتے تھے۔ گراؤنڈ کیا تھا، ایک خالی پلاٹ تھا جہاں محلے کے لڑکے شام کو کرکٹ کھیلتے تھے۔ اس پلاٹ کے اردگرد دُور و نزدیک دو منزلہ اور تین منزلہ مکان اور کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔

یہ چاروں دوست ہم عمر تھے اور ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔ ندیم میٹرک، حسن نویں، عمر اور نواز آٹھویں کلاس میں پڑھتے تھے۔

عمر بیٹنگ اور نواز باؤلنگ کرا رہا تھا جب کہ ندیم اور حسن فیلڈنگ کر رہے تھے۔ حسن اور ندیم اپنی اپنی باری کھیل چکے تھے جبکہ نواز کی باری ابھی آنی تھی۔ انہوں نے کھیلنے سے پہلے یہ شرائط طے کی تھیں کہ اگر کسی کھلاڑی کی ہٹ سے گیند کسی کے گھر چلی گئی تو وہ کھلاڑی آؤٹ ہو جائے گا۔ پھر جیسے ہی نواز نے باؤلنگ کرائی اور عمر نے زوردار انداز میں گیند کو ہٹ لگائی تو گیند اُڑتی ہوئی ایک مکان کے اندر چلی گئی۔

''حسن...... جاؤ گیند لے آؤ۔'' ندیم نے حسن سے کہا تو حسن آہستہ آہستہ دوڑتا ہوا اُس مکان کی طرف بڑھتا چلا گیا جس میں گیند گئی تھی جب کہ ندیم، نواز اور عمر باتیں کرنے میں مشغول ہو گئے۔ عمر نے بیٹ نواز کو پکڑا دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد انہیں حسن تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا واپس آتا دکھائی دیا۔

''حسن...... گیند نہیں لائے؟'' جیسے ہی حسن قریب پہنچا تو ندیم نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''گھر کے دروازے پر تالا لگا ہوا ہے۔'' حسن نے جواب دیا۔

''اوہو...... اب کیا کریں۔'' نواز نے کہا۔

''اگر کسی کے پاس گھر میں دوسری گیند پڑی ہو تو وہ لے آئے۔'' عمر نے کہا۔

''نہیں...... میرے پاس گیند نہیں ہے۔'' نواز نے کہا۔ پھر حسن اور ندیم نے بھی یہی جواب دیئے۔

''اب کیا کریں؟'' عمر نے کہا۔

''حسن...... تم گھر میں کود کر گیند اُٹھا لاتے۔'' نواز نے کہا۔

''میں کیسے دیوار پر چڑھوں، دیوار بہت اونچی ہے۔ وہاں دیوار کے پاس ایسی کوئی چیز بھی نہیں پڑی جس پر چڑھ کر میں مکان میں کود جاؤں۔'' حسن نے جواب دیا۔

''ندیم! تم اپنے گھر سے کرسی لے آؤ۔'' عمر نے ندیم سے کہا۔
''یار، کرسی رہنے دو۔ ہم حسن کی مدد کرتے ہیں۔ چلو حسن!'' نواز نے کہا اور پھر وہ تینوں حسن کے ساتھ اس مکان کی طرف بڑھ گئے۔ جب بھی ان کی گیند کسی کے گھر میں جاتی تھی اور اگر گھر کے دروازے پر تالا لگا ہوتا تھا تو کوئی نہ کوئی دیوار کود کر اس گھر سے گیند اُٹھا لاتا تھا۔
تھوڑی دیر کے بعد وہ مکان کے قریب پہنچ گئے۔ مکان کی دیوار سپاٹ اور بارہ فٹ بلند تھی۔ حسن نے صحیح کہا تھا، وہاں کوئی ایسی چیز نہ پڑی تھی جس پر چڑھ کر وہ اندر کود جاتا۔
''حسن! میرے کاندھوں پر چڑھ کر دیوار کود جاؤ۔'' ندیم نے کہا۔
''مگر میں باہر کیسے آؤں گا؟'' حسن نے کہا۔
''اندر کوئی کرسی یا میز پڑی ہوگی۔ تم اس پر چڑھ کر دیوار پر آ جانا باقی ہم تمہیں سنبھال لیں گے۔'' ندیم نے کہا تو حسن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر وہ ندیم کے کاندھوں پر سوار ہو گیا تو ندیم اسے اٹھائے دیوار کے قریب پہنچ گیا۔
''کیا اب تمہارے ہاتھ دیوار کے اوپر پہنچ رہے ہیں۔'' ندیم نے پوچھا۔
''ہاں۔'' حسن نے جواب دیا۔
''چلو، پھر جلدی کرو۔ احتیاط سے دیوار پر چڑھنا۔'' ندیم نے کہا تو حسن نے دیوار پر ہاتھ جمائے اور ندیم کے کاندھوں سے اتر کر دیوار پر بیٹھ گیا۔ اس نے مکان کے اندر جائزہ لیا تو اندر فرش زیادہ نیچے نہیں تھا۔ چنانچہ حسن نے ٹانگیں لٹکائیں اور پھر وہ اندر کود گیا۔
مکان کا صحن چھوٹا سا تھا۔ ایک سائیڈ پر برآمدہ تھا اور دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ ایک کمرے کے پاس کچن جب کہ دائیں طرف واش روم تھا۔ حسن گیند تلاش کرنے لگا لیکن اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد اسے کہیں بھی گیند دکھائی نہیں دی۔
''حسن! کیا گیند ملی؟'' باہر سے اسے ندیم کی آواز سنائی دی۔
''نہیں، میں تلاش کر رہا ہوں۔'' حسن نے بھی اُونچی آواز میں جواب دیا۔
''جلدی کرو، کہیں کوئی آ نہ جائے۔'' ندیم نے کہا۔
''اچھا۔'' حسن نے کہا۔ وہ بدستور صحن میں گیند تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ پھر اچانک اس کی نظر صحن میں نلکے کے پاس گیند پر پڑی تو وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اس نے گیند اُٹھا کر جیب میں رکھی۔
''گیند مل گئی ہے۔'' حسن نے اونچی آواز میں کہا تا کہ اس کے دوست سن سکیں۔ پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تا کہ کوئی چیز دیوار کے ساتھ رکھ کر وہ دیوار پر چڑھ جائے۔ پھر اس کے دوست اسے سنبھال لیں گے۔ برآمدے میں ایک اسٹول پڑا ہوا تھا۔ حسن نے اسٹول اُٹھا کر دیوار کے پاس رکھا اور اس پر چڑھ کر دیوار پر ہاتھ رکھے ہی تھے کہ اسی لمحے اسے گھر کا بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی تو حسن بے اختیار چونک پڑا۔ اس نے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا تو دروازہ کھلا اور ایک بوڑھی خاتون اندر داخل ہوئیں۔ انہوں نے جب حسن کو دیکھا تو انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔
''چور...... چور...... چور۔''
''نہیں...... نہیں...... میں چور نہیں ہوں...... آنٹی۔ میری بات سنیں...... میں چور نہیں ہوں۔'' حسن نے جلدی سے کہا لیکن وہ بوڑھی خاتون مسلسل چور چور کی آوازیں لگا رہی تھیں۔ حسن اسٹول سے نیچے اُتر آیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور گھبراہٹ کے تاثرات اُبھر آئے تھے۔
''چور...... چور...... کریم کے ابا، آپ کہاں ہیں؟ جلدی آئیں۔'' بوڑھی خاتون نے اس مرتبہ کسی کو پکارتے ہوئے کہا تو اسی لمحے ایک باریش بزرگ اندر داخل ہوئے۔ ان کے سر اور داڑھی کے بال برف کی مانند سفید تھے۔ ان کے دائیں ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی۔
''چور...... اوہ...... کہاں ہے چور۔'' باریش بزرگ نے کہا۔ پھر جب انہوں نے حسن کو دیکھا تو ان کے چہرے پر غصے کے تاثرات اُبھر آئے۔
''بدتمیز، ناہنجار لڑکے! تمہیں کسی کے گھر چوری کرتے ہوئے شرم نہیں آئی۔'' بوڑھے آدمی نے حسن کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ حسن کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا۔
''انکل۔ مم...... مم...... میں چور نہیں ہوں۔ میں چور نہیں ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم قریبی گراؤنڈ میں کرکٹ کھیل رہے تھے کہ ہماری گیند آپ کے گھر آ گئی تھی اور میں وہی گیند اُٹھانے آیا تھا۔ آپ میرے دوستوں سے پوچھ لیں۔ وہ باہر موجود ہیں۔'' حسن نے جلدی سے کہا۔
''خاموش! تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم چور ہو اور میرے گھر میں چوری کرنے آئے ہو۔ باہر گلی میں تمہارا کوئی بھی دوست موجود نہیں ہے۔ میں ابھی پولیس کو فون کرتا ہوں۔'' باریش بزرگ نے ایک بار پھر حسن کو ڈانٹتے ہوئے کہا تو حسن سمجھ گیا کہ اس کے تینوں دوست باریش بزرگ اور ان کی بیگم کو دیکھ کر فرار ہو گئے تھے۔ حسن

کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا کہ وہ اب کیا کرے۔ چور چور کی آوازیں سن کر محلے کے کچھ لوگ بھی گھر کے باہر جمع ہو گئے تھے۔

''آنٹی...... انکل...... میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں چور نہیں ہوں۔ آپ میری بات کا یقین کریں۔ میں قسم کھانے کو تیار ہوں۔ یہ دیکھیں میرے پاس گیند بھی ہے جو آپ کے گھر آئی تھی۔'' حسن نے رونی صورت بنا کر کہا اور پھر اس نے اپنی جیب سے گیند نکال کر باریش بزرگ کو دکھائی لیکن باریش بزرگ بدستور غصے میں تھے۔

''میں کیسے مان لوں کہ تم چور نہیں ہو...... اگر تم چور نہیں ہو تو میرے گھر کی دیوار کیوں کودے ہو۔ دیواریں تو وہ لوگ کودتے ہیں جو چور ہوتے ہیں۔'' باریش بزرگ نے کہا۔ اسی لمحے گھر میں ایک نوجوان آدمی داخل ہوا۔ وہ باریش بزرگ کا بیٹا کریم تھا۔ اس کی محلے میں کریانے کی دکان تھی۔ وہ بھی شور سن کر یہاں آ گیا تھا۔

''کیا بات ہے ابو...... یہ شور کیسا ہے؟'' کریم نے باریش بزرگ سے پوچھا۔

''کریم بیٹا! یہ لڑکا ہماری عدم موجودگی میں ہمارے گھر کی دیوار کود کر اندر آ گیا تھا۔ یہ کہتا ہے کہ ان کی گیند ہمارے گھر میں آ گئی تھی اور یہ اپنی گیند اُٹھانے ہمارے گھر آیا تھا۔'' باریش بزرگ نے اپنے بیٹے کریم سے کہا تو کریم نے حسن کی طرف دیکھا۔ وہ چونکہ حسن کو جانتا تھا اس لئے اس نے باریش بزرگ سے کہا۔

''ابو! یہ لڑکا ٹھیک کہہ رہا ہے کہ یہ چور نہیں ہے۔'' کریم نے کہا تو اس کے ابو نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیا مطلب، کیا تم اسے جانتے ہو؟''

''جی ہاں، ابو! یہ آپ کے اسٹوڈنٹ لیاقت صاحب کا بیٹا ہے، اس کا نام حسن ہے۔'' کریم نے جواب دیا تو باریش بزرگ اب حسن کو دیکھنے لگے۔

''تم لیاقت کے بیٹے ہو؟''

''جی انکل۔''

''آپ لوگ جا سکتے ہیں۔'' کریم نے گھر کے باہر موجود لوگوں سے کہا تو وہ وہاں سے چلے گئے۔

''آؤ حسن، بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔'' کریم کے ابو نے کہا اور پھر کریم ان کے ساتھ چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا۔

''بیٹا! مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم میرے اسٹوڈنٹ لیاقت کے بیٹے ہو مگر میں تم سے یہ ضرور کہوں گا کہ جس طریقے سے تم میرے گھر میں داخل ہوئے ہو یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں ہے۔ کسی کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ وہ کسی کے گھر میں بغیر اجازت داخل ہو۔ اگر گھر کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا تو تمہیں چاہئے تھا کہ تم لوگ ہمارے آنے کا انتظار کرتے اور ہمیں بتاتے کہ تمہاری گیند ہمارے گھر آ گئی ہے۔ اس طرح ہم گیند واپس کر دیتے۔'' باریش بزرگ حسن سے مخاطب ہوئے۔ ان کا لہجہ نرم تھا۔ ''بغیر اجازت کسی کے گھر کودنا، یہاں تک کہ گھر میں داخل ہونا سراسر جرم اور اخلاق سے گری ہوئی حرکت ہوتی ہے اور یہ جرم اس وقت تو زیادہ سنگین ہو جاتا ہے جب گھر کے دروازے پر تالا لگا ہوا ہو یا گھر میں کوئی موجود نہ ہو اور گھر میں داخل ہوا جائے۔''

حسن کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات اُبھر آئے۔

''انکل! میں آپ سے معافی مانگتا ہوں کہ میں آپ لوگوں کی عدم موجودگی میں آپ کے گھر داخل ہوا ہوں۔ میں آپ کے سامنے عہد کرتا ہوں کہ میں آئندہ کبھی کسی کے گھر بغیر اجازت داخل نہیں ہوں گا اور نہ ہی بند گھر میں کودوں گا۔'' حسن نے شرمندگی آمیز لہجے میں کہا۔

''بہت اچھی بات ہے، اللہ تمہیں اپنے عہد پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے...... اب تم جاؤ اور اپنے دوستوں کو بھی بتاؤ تا کہ وہ بھی آئندہ ایسی حرکت نہ کریں۔'' باریش بزرگ نے کہا تو حسن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر اس نے باریش بزرگ، بوڑھی خاتون اور کریم کو سلام کیا اور گھر سے نکل کر گراؤنڈ کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے تینوں دوست گلی کی نکڑ پر ہی موجود تھے۔ انہوں نے جب حسن کو دیکھا تو وہ تیزی سے اس کے پاس آ گئے۔

''حسن! تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے، کیا تمہیں مار تو نہیں پڑی؟'' ندیم نے تیزی سے پوچھا۔

''مار تو نہیں پڑی البتہ اخلاقی سبق ضرور حاصل ہو گیا ہے۔'' حسن نے جواب دیا تو اس کے تینوں دوست چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''وہ کیا؟'' نواز نے پوچھا تو حسن نے ساری بات بتا دی۔

''حسن! انہوں نے ٹھیک کہا ہے یہ واقعی گھٹیا حرکت ہے۔ ہم بھی تمہارے ساتھ عہد کرتے ہیں کہ ہم بھی آئندہ کسی کے گھر بغیر اجازت داخل نہیں ہوں گے۔'' تینوں دوستوں نے باری باری کہا، پھر وہ چاروں گراؤنڈ کی طرف بڑھ گئے۔ آج انہیں اخلاقی سبق مل چکا تھا۔

مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

میں کافی عرصے بعد تعلیم و تربیت میں شرکت کر رہی ہوں۔ اس ماہ 2 دسمبر کو میری سال گرہ تھی۔ مجھے مبارک باد ضرور دیجیے گا۔ اس کے علاوہ میرے اور کزنز کی بھی سال گرہ ہے، ان کو بھی مبارک باد دیں۔ اس ماہ میرے امتحانات بھی ہوئے ہیں۔ میری کامیابی کے لیے دعا کیجیے گا۔ تعلیم و تربیت ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ٹاپ پر تھا۔ تمام کہانیاں زبردست تھیں۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو اور ترقی دے۔ آمین!
(منابل نسیم، اسلام آباد)

ڈیئر آپی! میں تعلیم و تربیت کی مستقل قاری ہوں۔ آج خط لکھنے کی ہمت کی ہے جس کو آپ کی نظرِ کرم ہو جائے تو مجھے دلی خوشی ہوگی۔ میں تعلیم و تربیت کو بہت پسند کرتی ہوں اور مجھے اس کا ہر سلسلہ اچھا لگتا ہے۔ امید ہے مجھے مایوس نہیں کریں گی۔ شکریہ! (طیبہ ندیم، اٹک)

السلام علیکم! آپی، امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ تعلیم و تربیت میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ میں اسے بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ میرا یہ تعلیم و تربیت میں پہلا خط ہے۔ امید ہے کہ اس خط کو میرے پیارے رسالے کے خطوط صفحے پر تھوڑی سی جگہ ملے گی اور آپ اس خط کو ردی کی ٹوکری سے محفوظ رکھیں گی۔ دسمبر کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ تمام کہانیاں نمبر ون تھیں۔ میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ''اللہ میرے پیارے رسالے کو دن دگنی رات چگنی ترقی عطا کرے۔'' آمین!
(حمزہ اظہر، لاہور)

ایڈیٹر صاحبہ! میں تعلیم و تربیت کی نئی قاریہ ہوں۔ کیسی ہیں آپ؟ نومبر کا رسالہ بہت اچھا تھا۔ ''دولت پور میں'' کی جگہ ایک اور مزے دار ناول شروع کیجیے۔ میرے گھر والے تعلیم و تربیت شوق سے پڑھتے ہیں۔ کیا میں ایک کہانی بھیج سکتی ہوں؟ میرا خط ضرور شائع کیجیے گا۔
(منیبہ شہباز، لاہور)

☆ آپ کہانی بھیج سکتی ہیں۔ معیاری ہوئی تو ضرور شائع کریں گے۔

میرا نام رابعہ ہاشمی ہے۔ میں دس سال کی ہوں اور قرآنِ پاک حفظ کر رہی ہوں۔ مجھے قرآنِ پاک پڑھنے کے بعد ٹائم کم ملتا ہے مگر جب بھی ملتا ہے میں کتابیں پڑھنا پسند کرتی ہوں۔ خاص طور پر تعلیم و تربیت پڑھنا پسند کرتی ہوں۔ آپ سب بھی میرے لیے دعا کیجیے گا کہ میرا حفظ جلد مکمل ہو اور میں اس پر عمل کر سکوں۔ (رابعہ ہاشمی، کراچی)

☆ آپ کے لیے بہت سی دعائیں۔

ایڈیٹر صاحبہ، السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟ یہ میرا پہلا خط ہے۔ میں تعلیم و تربیت کی چار سال سے مسلسل قاریہ ہوں۔ یہ ایک بہت ہی اچھا، عمدہ اور سب سے منفرد رسالہ ہے۔ مجھے یہ بہت اچھا لگتا ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ شرکت کی ہے۔ امید ہے میرا خط ضرور شائع کریں گی۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی، رات چگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین!
(لائبہ نذیر، لاہور)

محترمہ ایڈیٹر صاحبہ، السلام علیکم! میں آپ کو پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ میں تعلیم و تربیت تین سال سے پڑھ رہی ہوں۔ یہ ایک بہت عمدہ رسالہ ہے۔ دسمبر کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ ''وفا'' کہانی بہت اچھی لگی۔ آپ سے ایک درخواست ہے کہ اس میں علامہ اقبال کے شعر اور نظمیں بھی شامل کریں۔ (عائزہ ندیم، لاہور)

ڈیئر ایڈیٹر تعلیم و تربیت، السلام علیکم! کیسے ہیں آپ لوگ؟ امید کرتی ہوں کہ سب خیریت سے ہوں گے۔ میں آپ کو بتاتے ہوئے فخر محسوس کرتی ہوں کہ مجھے سلسلہ کھوج لگائیے میں انعام ملا ہے۔ میں نے یہ رسالہ خود فیروز سنز سے جا کر خریدا ہے جو لاہور میں ہے۔ 17 دسمبر کو میرے چھوٹے بھائی کی سال گرہ ہے۔ میں نے آپ سے پہلے بھی پوچھا تھا کہ کیا ہم بغیر تصاویر کے کہانیاں بھیج سکتے ہیں؟ مجھے تعلیم و تربیت پڑھتے ہوئے تقریباً پورا ایک سال ہو گیا ہے۔ تعلیم و تربیت ایک بہت ہی شان دار رسالہ ہے۔ دسمبر کے شمارے میں نور محل کی کہانی، وفا، مغرور شہزادہ، کالا جادوگر، خاص کر محاورہ کہانی سپرہٹ تھیں۔ تعلیم و تربیت بچوں، بڑوں دونوں کے لیے مفید ہے کیوں کہ یہ ان کی شخصیت کے نکھار میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ آپ سب کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم کو سلامت رکھے۔
(وردہ زہرہ، جھنگ)

☆ جی ہاں! آپ تصاویر کے بغیر کہانیاں بھیج سکتے ہیں۔

السلام علیکم، ایڈیٹر صاحبہ! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ اللہ

پاک آپ کو اور آپ کی ٹیم کو اپنی امان میں رکھے۔ ہمیشہ کی طرح دسمبر کا شمارہ بہت پسند آیا۔ تمام کہانیاں قابلِ تعریف تھیں، خاص طور پر کالا جادوگر اور مغرور شہزادہ۔ محاورہ کہانی ہمیشہ کی طرح ٹاپ پر تھی۔ میں تین سال سے تعلیم و تربیت کی خاموش قاریہ ہوں۔ تعلیم و تربیت بہت عمدہ میگزین ہے۔ اگلے مہینے میرے امتحان ہیں، اس لیے دعا کیجیے گا کہ اللہ تعالیٰ مجھے کام یابی عطا کرے۔ امید کرتی ہوں کہ آپ میرا خط ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں کریں گے، ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ آخر میں دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی، رات چگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین!

(مریم رابعہ، راول پنڈی)

اس بار رسالہ یکم دسمبر کو ہی مل گیا۔ بہت خوشی ہوئی مگر اپنی کوئی تحریر چھپی ہوئی نہ دیکھ کر خاصا دکھ بھی ہوا۔ جنوری میں میرے دادا جان کی سال گرہ ہے۔ وہ الحمدللہ 81 برس کے ہو جائیں گے۔ انہیں تعلیم و تربیت کی طرف سے سال گرہ کی مبارک باد ضرور دیں۔ میری کام یابی کے لیے دعا کریں اور پلیز میری تحریریں باقاعدگی کے ساتھ شائع کیا کریں ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔ میں نے پچھلے ماہ آپ بھی لکھیے کے لیے ایک کہانی ''تماز'' ارسال کی تھی، اس کا کیا بنا؟ ضرور جواب دیں۔

(حرا سعید شاہ، جوہر آباد)

☆ ہم سب کی طرف سے آپ کے دادا جان کو سال گرہ مبارک ہو۔

السلام علیکم! امید ہے کہ آپ اور تعلیم و تربیت کی باقی ٹیم خیریت سے ہو گی۔ آپ کو نیا سال بہت بہت مبارک ہو۔ میں آپ کا رسالہ تقریباً پچھلے آٹھ سال سے پڑھ رہی ہوں۔ دسمبر کا شمارہ عروج پر تھا۔ مختصر مختصر بہت اچھا سلسلہ ہے۔ اسے جاری رکھیے گا۔ اس شمارے میں اوجھل خاکے نہیں ملے۔ کیا یہ سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے؟ کہانیوں میں نہلے پہ دہلا اور عجیب و غریب جزیرہ اچھی تھیں۔ بلاعنوان میں تیسرا عنوان ''نہیں!...... یہ نہیں ہو سکتا!'' مزے کا نہیں لگا۔ باقی عنوانات بہت اچھے تھے۔ آخر میں درخواست ہے کہ اس خط کو تعلیم و تربیت کی محفل میں شرکت کا شرف بخشا جائے۔

(صبغہ قمر، فیصل آباد)

☆ اس مرتبہ اوجھل خاکے شاملِ اشاعت ہے۔

مدیر تعلیم و تربیت، السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں یہ خط لکھتے ہوئے بہت خوشی محسوس کر رہی ہوں۔ مجھے اپنا بچپن یاد آ رہا ہے جب میں باقاعدہ آپ کے شمارے میں خط لکھتی تھی اور مختلف سلسلوں میں حصہ لیتی تھی۔ میں نے بے تحاشا انگلش اور اُردو ادب پڑھا ہے لیکن آج بھی میں تعلیم و تربیت کا نیا شمارہ آنے کا اسی بے چینی سے انتظار کرتی ہوں جیسے اپنے بچپن میں کرتی تھی۔ میرے بچے اس بات پر بہت ہنستے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہر ماہ تعلیم و تربیت کا کوئی نہ کوئی مضمون یا کہانی مجھے چونکا دیتی ہے اور میں مطمئن ہو جاتی ہوں کہ آج کی نسل کو یہ بہترین راہ نمائی آپ کے شمارے کی صورت میں حاصل ہے۔ اللہ آپ کے اس جہاد میں آپ کا حامی و ناصر ہو اور آپ کو مزید ترقی عطا کرے۔ آمین!

میگزین کے مختلف کونوں میں دی گئی معلومات بے حد مزہ دیتی ہے۔ ''لاہور'' پر معلوماتی مضمون بے حد اچھا تھا۔ نمازوں کے اوقات اور رکعتوں کی تعداد یقیناً بچوں کے لیے بے حد راہنمائی کا باعث ہے۔ میری بیاض سے اور مختصر مختصر میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ قائداعظم کے حوالے سے دونوں مضامین انتہائی اعلیٰ تھے۔ سندباد جہازی کا پہلا سفر پڑھ کر مزہ آیا کیوں کہ سیر و سیاحت پڑھنا مجھے ہمیشہ سے پسند ہے۔ مجھے امید ہے آپ جناب مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے بھی شائع کریں گے۔

شمارہ کے شروع میں ایڈیٹر صاحبہ جو بچوں سے بات چیت کرتی ہیں وہ ہمیشہ سے بہت متاثر کن ہوتی ہے جو بچوں کے ذہنوں پر یقیناً بہت مثبت اثرات مرتب کرتی ہے...... امید ہے ''نسیم حمید'' اور ''ملالہ'' جیسی اور بیٹیوں کے بارے میں بھی آپ بچوں کو ہمت افزا معلومات دینے کا سلسلہ جاری رکھیں گے......

(فریدہ افضل، لاہور)

ان ساتھیوں کے خطوط بھی بڑے مثبت اور اچھے تھے، تاہم جگہ کی کمی کے باعث ان کے نام شائع کیے جا رہے ہیں:

عماد احمد منیر، ادیبہ حسن، مریم بیگ، شہزادی خدیجہ شفیق، عبدالجبار رومی، عابد رحمان، صداقت علی، مریم اعجاز، عبداللہ شعیب، محمد علیان جمشید، نمرہ عبدالخالق، لاہور۔ آمنہ طارق، حفصہ طارق، محسن علی، حسن ابدال۔ عمردراز اعوان، کسووال۔ انعم محمد حنیف، کراچی۔ ابرار خان، کوئٹہ۔ مزمل بہروز، نوشہرہ۔ زعیمہ خان، صباحت فاطمہ، میانوالی۔ عدن سجاد، جھنگ صدر۔ ماریہ عبدالناصر، کلورکوٹ۔ محمد احمد خاں غوری، زینب سحر، بہاول پور۔ ام حبیبہ، واہ کینٹ۔ محمد مبشر شاہ، کوہاٹ۔ محمد عبدالمنعم، سمندری۔ فضہ فاطمہ، فاکہہ، حفصہ، بلال، اسلام آباد۔ نجل فاروق، زینب ناصر، محمد حنظلہ سعید، فیصل آباد۔ رانا بلال احمد، بھکر۔ طلحہ ظفر انصاری، فتح محمد شارق، نوشہرہ۔ وجاح ماجد، کوٹ رادھا کشن۔ زوہیب مصطفیٰ، جوہر آباد۔ محمد حمزہ سعید، بورے والا۔ ثنا سعید، گوجرانوالہ۔ فلزہ وقار، طیب توقیر، جہلم۔ یمنہ سجاد، مقدس چوہدری، افراح سجاد، راول پنڈی۔ معوذ الحسن، ڈیرہ اسماعیل خان۔ محمد مہدی اکبر غوری، محمد عبدالوہاب، بھکر۔ زونیرہ ادریس، لاہور۔ نور فاطمہ، کراچی۔

مگرمچھ کے آنسو

زبیدہ سلطانہ

کہتے ہیں کسی دریا میں ایک مگرمچھ رہتا تھا۔ کنارے پر رہنے والے چھوٹے چھوٹے جانوروں سے اس کی دوستی تھی۔ گرمیوں میں وہ دریا سے سر نکال کر لومڑی، خرگوش، گیدڑ وغیرہ سے باتیں کیا کرتا تھا۔ سب اسے بے ضرر جان کر اس سے مانوس ہو گئے تھے۔ وہ بھی اکثر دریائی جانوروں پر گزارا کرتا البتہ کبھی کبھار چپکے چپکے کسی خرگوش وغیرہ کو بھی لقمہ بنا لیتا مگر بڑی احتیاط اور رازداری سے......!

بہت سالوں بعد جب مگرمچھ بوڑھا ہو گیا تو وہ خوراک کی تلاش میں اپنے ٹھکانے سے دُور نہ جا سکتا تھا۔ اس کے علاقے کے آبی جانور محتاط ہو کر اس خطرناک علاقے سے کوچ کر گئے تھے۔ مگرمچھ روزمرہ کی غذا کے لیے بڑا پریشان رہنے لگا۔ پانی کی بجائے اب وہ زیادہ تر خشکی پر بے سُدھ پڑا رہتا۔ کبھی کسی وقت ذرا سی آنکھ کھول کر اپنے اردگرد کا جائزہ لیتا۔ کبھی کوئی بگلا دریا کے کنارے پر کیچوے یا چھوٹی مچھلیاں تلاش کرتا یا پَروں میں چونچ دبائے اونگھتا نظر آ جاتا تو آہستہ آہستہ رینگتا ہوا اس کے قریب پہنچتا اور لپک کر اسے جبڑوں میں داب لیتا۔

ایک لومڑی سے مگرمچھ کی دوستی تھی۔ اسے مگرمچھ پر بڑا ترس آتا اور وہ اکثر اِدھر اُدھر سے چھوٹے موٹے جانوروں کو گھیر کر لے آتی اور مگرمچھ کی خوراک کا انتظام کر دیتی۔ ایک دن لومڑی آئی تو نہ صرف خالی ہاتھ تھی، بلکہ بے حد پریشان تھی اور رو رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ شیر نے اس کے دونوں بچوں کو کھا لیا ہے۔ یہ سن کر مگرمچھ بھی زار زار رونے لگا۔ وہ اتنی دردناک آواز سے رو رہا تھا کہ خود لومڑی اس کی محبت اور ہمدردی کے اس قدر شدید اظہار سے متاثر ہو کر گھبرا گئی کہ بوڑھا جانور ہے، ایسا نہ ہو کہ صدمے سے مر جائے اور اسے بچوں کے بعد اس ہمدرد دوست سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں۔ اس خیال سے وہ اس کے بہت قریب آ بیٹھی اور اسے تسلی دینے لگی۔ مگرمچھ کے پیٹ میں مارے بھوک کے سینکڑوں چوہے دوڑ رہے تھے۔ جب لومڑی اس کے بہت قریب آ بیٹھی تو اس نے اچانک جھپٹ کر اسے اپنے جبڑوں میں بھر لیا اور آناً فاناً نگل گیا۔ درخت پر ایک مینا بیٹھی یہ ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔ اس نے ''ٹیں ٹیں'' کر کے سب جانوروں کو جمع کر لیا اور سب کو یہ واقعہ سناتے ہوئے بولی:

''دوستو! مگرمچھ کے آنسو مکاری کے آنسو تھے اس لیے کبھی کسی مگرمچھ کے آنسوؤں پر اعتبار نہ کرنا۔'' یہ سن کر طوطے نے کہا:

''میں ایک ایسے جانور سے واقف ہوں جسے انسان کہتے ہیں اور وہ بھی مگرمچھ کی طرح مکروفریب کے آنسو بہا سکتا ہے۔'' اس کہانی سے پتا چلا کہ مکروفریب اور جھوٹ موٹ کے رونے کو محاورے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے ''مگرمچھ کے آنسو'' کہا جاتا ہے۔

حضورِ پاکؐ کی حیاتِ مبارکہ میں اعلانِ نبوت سے لے کر ان کی وفات تک جہاں کہیں نبی کریمؐ نے صحابہ کرامؓ کو درس یا تربیت دی وہ جگہ عظیم درس گاہ کی حیثیت رکھتی ہے، چاہے وہ دارِ ارقم ہو یا صفہ مسجد کی درس گاہ۔ آپؐ کے وصال کے بعد چند مشہور درس گاہیں، جنہوں نے اسلامی تعلیمات اور ان کے فروغ و حفاظت میں کردار ادا کیا ان کا ذکر کریں گے۔

1- جامع عمر 2ھ میں تھی۔
2- جامع دمشق 96ھ میں بنی۔
3- جامع المنصور 145ھ میں بنی۔
4- جامع کوفہ دوسری صدی ہجری کو بنی۔
5- جامع الحاکم 290ھ کو بنی۔
6- جامع الازہر مصر کی سب سے عظیم اور قدیم یونیورسٹی۔
7- جامع سعیدیہ نصر بن سبکتگین نے 289ھ میں تعمیر کرائی۔
8- جامع بیہقیہ امام بیہقی نے 384ھ میں نیشاپور میں تعمیر کرائی۔
9- جامع نظامیہ نظام الملک طوسی نے امام الحرمین کے لیے بغداد میں چوتھی صدی ہجری میں تعمیر کرائی۔
10- جامع اصفہانیہ، ابو اسحاق اصفہانی نے چوتھی صدی ہجری میں بلخ کے مقام پر تعمیر کرائی۔
11- دار السعد، السعد صلاح الدین ایوبی نے 569ھ میں تعمیر کرائی۔
12- دار الحدیث النوریہ نور الدین زنگی نے 563ھ میں تعمیر کروایا۔
13- جامع زیتون حکومت حفصیہ کے عہد میں ساتویں صدی ہجری میں افریقہ میں قائم ہوا۔ مرکز علوم عثمانیہ مغربی سوڈان میں ٹمبکٹو کے مقام پر چھٹی صدی ہجری میں تعمیر ہوا۔
14- جامع نجف پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں جناب ابو جعفر طوسی نے اس کی بنیاد رکھی۔
15- مستنصریہ، خلیفہ مستنصر نے 631ھ میں اس کا سنگِ بنیاد رکھا۔
16- دار العلوم غزنویہ، سلطان محمود غزنوی نے 410ھ میں غزنی کے مقام پر اس مدرسے کی بنیاد رکھی۔
17- دار العلوم قسطنطنیہ سلطان محمد فاتح نے 865ھ میں ترکی میں قائم کیا۔
18- جامع قرطبہ عبد الرحمٰن الداخل نے سپین کے شہر قرطبہ میں اس مدرسے کی بنیاد رکھی۔
19- جامعات اشبیلہ و طلیہ اندلسی دور کی مشہور درس گاہیں۔
20- جامعات غرناطہ و مالقہ۔
21- مدرسہ النوریہ الکبریٰ چھٹی صدی ہجری میں دمشق میں تعمیر ہوا۔
22- مدرسۃ الناصرہ ملک منصور قلاوُن نے 689ھ میں تعمیر کیا۔
23- مدرسہ ازبق ترکوں نے آٹھویں صدی ہجری میں ازبق کے مقام پر اس کی بنیاد رکھی۔

زمانۂ قدیم میں درس گاہوں کے ذریعے علومِ اسلامی پر بے پناہ توجہ دی گئی۔ اسلامی تاریخ میں ابن حوقل کی گنتی کے مطابق صرف صقلیہ کے معمولی شہر میں چھ سو مکتب تھے۔ ابو القاسم بلخی اپنی تاریخ میں خود اپنے مکتب کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس میں تین ہزار طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے اور ان کا مکتب اس قدر وسیع تھا کہ اس میں طلبہ کی نگرانی و حالات سے واقفیت کے لیے سواری استعمال کرنا پڑتی تھی۔

جن لوگوں کے ذریعے درس گاہوں سے لوگوں نے بے شمار استفادہ کیا ان میں امام احمد بن حنبلؒ کا اسم گرامی ضرور یاد رکھا جائے گا۔ آپ نے درس و تدریس کا سلسلہ چالیس سال کی عمر میں شروع کیا۔ آپ کی درس گاہ کی دو نشستیں ہوتی تھیں، ایک خصوصی طلبہ کے لیے جو اپنے ہی مکان پر منعقد فرماتے تھے اور دوسری عمومی نشست جو احاطۂ مسجد میں منعقد کرتے تھے۔ آپ چودہ برس تک نہایت اطمینان کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول رہے۔

سپین کی اسلامی درس گاہیں

سپین پر مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ اقتدار میں غرناطہ، قرطبہ، اشبیلیہ اور طلیطلہ مشہور جامعات تھیں جن کے رتبے اور نظامِ تعلیم کی مثال آج کل کے زمانے میں انٹرنیشنل یونیورسٹیز کی تھیں۔ قصبات اور دیہات کے مدارس بھی کسی نہ کسی یونیورسٹی سے منسلک تھے۔ صرف قرطبہ یونیورسٹی میں کام کرنے والے عملے کی تعداد گیارہ ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ان جامعات (یونیورسٹیز) نے اسلام کے فروغ میں اچھا کردار ادا کیا۔ اندلس کا محکمۂ اوقاف مدارس کے اخراجات برداشت کرتا۔

محدثین اور علماء نے درس گاہوں کے ذریعے دینی علوم کی نشریات میں بھرپور حصہ لیا۔ سپین کے چند ایک علماء کے نام درج ذیل ہیں۔ اندلس میں ایسے علماء بھی تھے جو امام مالکؒ کے شاگرد تھے۔ ابن علی نے براہ راست امام مالکؒ سے فیوض حاصل کیا۔ سپین (اندلس) میں دُور دراز کے شہروں سے علماء اکٹھے ہوئے۔ ابو عبدالرحمن محمد، ابو محمد اشبیلی، قاضی عبدالحکم منزر، ابو ایوب البطلیموس، ابو محمد قاسم، محمد بن عبدالملک، ابن وضع، ابو الولید، برازعی سرقطی، عمر بن عبدالبر، ابو القاسم، ابو عمر والدانی سپین میں ایسے علماء تھے جنہوں نے دین کے فروغ کا کام کیا۔

قرطبہ میں ستر ہزار لائبریریاں تھیں۔ ہزاروں کی تعداد میں دکانوں پر بیس ہزار سے زائد افراد کام کرتے تھے۔ قرطبہ کی شاہی لائبریری میں دو لاکھ سے زائد کتب موجود تھیں۔ تین ہزار آٹھ سو مساجد 936 عیسوی تک موجود تھیں۔ قرطبہ کے شہر کی مشہور یونیورسٹی تھی، جہاں قابل ترین علماء لیکچرز دیتے تھے۔ اس طرح قرطبہ شہر نے حفاظت اور فروغ میں اچھا کردار ادا کیا۔ قرطبہ کے مشہور محدث ہموانی ابن حزم کو سماعتِ حدیث کا درس دیا تھا۔

درس گاہوں سے مستفید علماء نے کتب بھی تصنیف کیں، مثلاً احادیث کے ضمن میں ابن اصبغ اور ابن الملک کے نام مشہور ہیں۔ اس ابن نے کتاب الاحکام لکھی تھی۔ بخاری شریف کے ابواب تدوین کیے۔ ایک کتاب المجتبیٰ لکھی۔ ابو ایوب البطلیموس نے بخاری شریف کی شرح لکھی۔

کہا جاتا ہے کہ بخاری شریف کی مشہور شرح فتح الباری بھی اسی کی مدد سے لکھی گئی تھی، اس کے علاوہ بھی حدیث پر بے شمار کام کیا گیا۔ زوالِ سپین کے بعد مراکش کے ایک صاحبِ علم و ذوق نے کتب کو تین بحری جہازوں پر منگوایا جنہیں اسکوریال نامی ایک محل میں رکھوا دیا گیا جو میڈرڈ سے 25 میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس طرح مسلمان علماء کی کتب کا ذخیرہ اسکوریال کا کتب خانہ بھی تھا جسے اہلِ علم بہت قیمتی جانتے تھے۔

سپین میں کاغذ کی صنعت کو بے حد فروغ تھا۔ اس طرح مسلمان علماء نے بے شمار احادیث کے ذخیرے کو کتب کی شکل میں محفوظ کیا۔ دیگر اسلامی ممالک سے بھی کتب سپین بھیجی جاتی اور سپین کے علماء کی کتب دیگر ممالک میں بھیجی جاتی۔ ان سپینی مسلم علماء کی کتب میں بہت سی دیگر کتب کا نچوڑ ہوتا تھا۔ ابو عمر نے جو کتاب لکھی وہ پندرہ کتابوں کا نچوڑ تھی۔

ان سپینی علماء نے صحاح ستہ کی کتب احادیث کو بھی سپین میں متعارف کروایا۔ صحاح ستہ سے احادیث کو منتخب کر کے الگ الگ عنوانات کے تحت جمع کیا گیا۔ سپین کی مسلمان حکومت نے ان مسلمان علماء کے وظائف مقرر کیے کہ وہ علمی کام پر زیادہ وقت لگائیں۔

غرض یہ کہ سپین کے مسلمان علماء نے درس گاہوں کے فروغ میں جو کردار ادا کیا، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فارس، شام، عراق، افریقہ اور حجازِ مقدس کے علاوہ سپین دینی علوم کا مرکز رہا ہے۔ (باقی آئندہ)

☆☆☆

پیارے بچو! ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی ملک پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ نام نہ جانے کیا تھا بہرحال وہ بہت لالچی اور بدطینت تھا۔ دولت سے اندھی محبت کرتا تھا۔ اس نے عوام کا پیسہ اینٹھنے کے لیے بے جا ٹیکس لگا رکھے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رعایا غریب سے غریب تر ہوتی گئی۔

اب لوگوں کی استطاعت سستی سے سستی کھانے کی چیز خریدنے کی بھی نہیں رہی تھی اور سستے سے سستا کپڑا بھی وہ خرید کر نہیں پہن سکتے تھے۔ اگر وہ ٹیکس ادا نہ کر سکتے تو بادشاہ کے سپاہی انہیں غیر معینہ مدت کے لیے جیل میں پھینک دیتے۔ بادشاہ بہت فربہ اندام تھا کیوں کہ ہر وقت کھاتے رہنا ہی اس کا واحد مشغلہ تھا۔ وہ ہر وقت مہنگی ترین پوشاک زیب تن کیے رکھتا۔ وہ صرف بدطینت نہ تھا بلکہ حد سے زیادہ بگڑا ہوا بھی تھا۔ وہ اکثر شہر کی گلیوں میں اپنی سونے سے بنی رتھ میں بیٹھ کر نکلتا جسے بارہ نقرئی گھوڑے کھینچ رہے ہوتے اور جب اِدھر اُدھر کھڑے عام لوگ اس کی رتھ دیکھ کر سر کو جھکاتے تو اسے بڑی طمانیت ہوتی۔ وہ سمجھتا کہ وہ دُنیا کا سب سے دولت مند بادشاہ ہے کیوں کہ نہ تو کسی کے پاس اس جتنی دولت تھی اور نہ ہی کوئی اس جیسی خوب صورت پوشاک پہنتا ہے لیکن ایک دن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک اجنبی بادشاہ اس کی ریاست میں داخل ہوا۔ وہ عام سا شخص تھا جس نے سبز اور بھورے رنگ کے کپڑے، پہنے ہوئے تھے لیکن اس کی آنکھیں بہت روشن تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک بانسری تھی جسے جب وہ منہ سے لگاتا تو بڑی مدھر تانیں چھیڑتا اور ایسے لگتا جیسے پرندے خوشی سے چہچہا رہے ہوں۔ وہ ایک گاؤں میں خوشی خوشی داخل ہوا۔ بانسری کی آواز سن کر لوگ گھروں سے باہر نکل آئے۔ وہ جو دھن بجا رہا تھا، اس کے خیال میں لوگوں کو وہ اتنی پسند آنی چاہیے تھی کہ ان کے چہرے کھل اُٹھتے اور دھن پر ان کے پاؤں تھرکنا شروع ہو جاتے مگر لوگ گھروں سے باہر نکلے تو ضرور لیکن وہ اتنے کمزور اور غمگین تھے کہ بانسری نواز ان کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ ”تم لوگوں نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ کیا تم جان بوجھ کر فاقہ کشی کر رہے ہو؟ یقیناً تمہارے کھیتوں میں اتنا تو اناج اُگتا ہو گا جس سے تمہارے چہروں پر رونق ہونی چاہیے اور جسموں میں طاقت۔“ اس نے لوگوں سے کہا تو ایک بوڑھی عورت نے سرگوشی کے انداز میں اسے بتایا کہ ہمارا بادشاہ ہم سے سارا اناج چھین لیتا ہے اور جو باقی بچتا ہے، وہ صرف اتنا ہوتا ہے کہ زندگی سے ہمارا رشتہ بس استوار رہے۔ بانسری نواز یہ باتیں سن کر خود بھی افسردہ ہو گیا۔ پھر وہ اگلے گاؤں گیا تو وہاں بھی اس نے غریب لوگوں کے تباہ حال گھروں کو دیکھا۔ اس نے وہاں بھی بانسری نواز کو بتایا کہ بادشاہ ان کے پاس کچھ رہنے دے تو وہ گھروں کی مرمت کریں۔ بانسری نواز نے اپنی بانسری کی مدھر

دھنوں سے وہاں بھی لوگوں کو خوش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ لوگوں کے چہرے سے افسردگی دُور نہ کرسکا۔ بانسری نواز نے ان لوگوں سے افسردہ آج تک کوئی نہیں دیکھا تھا۔ بانسری نواز لوگوں کی حالت دیکھ کر سخت آزردہ تھا۔ وہ رات اس نے اسی گاؤں میں گزاری اور صبح اگلی منزل کے لیے روانہ ہوگیا۔ جلد ہی وہ بادشاہ کے شہر میں جا پہنچا۔ وہ ابھی شہر میں مٹرگشت کررہا تھا کہ اس نے ڈھول پیٹے جانے کی آوازیں سنیں اور پھر ایک گلی سے بادشاہ کی سونے کی رتھ نمودار ہوئی جس پر بادشاہ اپنے پورے کروفر سے سوار تھا۔ بانسری نواز ایک طرف کھڑا یہ سارا تماشا دیکھتا رہا۔ ''بادشاہ سلامت! تم بہت ہی بگڑے ہوئے ہو، بہت لالچی دکھائی دیتے ہو اور تم بہت امیر بھی ہو۔ میں تمہاری یہ کمزوریاں کیسے لوگوں کے حق میں استعمال کرسکتا ہوں۔'' وہ سوچ رہا تھا۔ وہ سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ آخر اس کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس کے ذہن میں بادشاہ کو سبق سکھانے کے لیے ایک ترکیب آئی۔ وہ ایک قریبی کھیت میں گیا جہاں اسٹرابیریز کاشت کی ہوئی تھیں۔ اس نے سونے کے دو سکے کسان کو دیئے تو اسے اجازت مل گئی کہ وہ جہاں سے چاہے، جتنی چاہے اسٹرابیریز اکٹھی کرلے۔ اسٹرابیریز بہت پکی ہوئی تھیں۔ جلد ہی بانسری نواز نے اپنی ٹوکری سرخ سرخ اسٹرابیریز سے بھرلی۔ اتنے مزے کی اسٹرابیریز اس نے کبھی زندگی میں نہیں دیکھی تھیں۔ پھر اس نے ٹوکری کھیت کے ایک کونے میں رکھی اور اس پر بانسری سے ایک جادو بھری دھن بکھیر دی اور سارا وقت بانسری بجاتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری رہی۔ پھر اسی سہ پہر اس نے اسٹرابیریز سے بھری ٹوکری اُٹھائی اور اسے لے کر محل کے سامنے پہنچ گیا اور اِدھر اُدھر ٹہل کر صدا لگانے لگا۔ ''اسٹرابیریز لے لو، اسٹرابیریز! دُنیا میں سب سے میٹھی اور رسیلی اسٹرابیریز لے لو۔'' بادشاہ اتفاقاً جھروکے میں ہی بیٹھا تھا۔ اس کے کانوں میں جونہی یہ آواز پڑی، اس نے فوراً جھروکے کے باہر جھانکا۔ اس نے جیسے ہی ٹوکری میں مزے دار اسٹرابیریز دیکھیں، فوراً اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اسے اسٹرابیریز بہت پسند تھیں۔ اس نے فوراً ایک پیادے کو بانسری نواز کے پاس بھیجا اور کہا کہ پوچھ کر آؤ کہ ان اسٹرابیریز کی کیا قیمت ہے؟ پیادے نے بانسری نواز سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ بادشاہ سلامت کو کہو کہ اس نے انہیں دو سونے کے سکوں میں خود خریدا ہے اور تین سونے کے سکوں میں انہیں بیچے گا کیوں کہ سخت دھوپ میں اس نے محنت سے انہیں چنا ہے۔ پیادے نے یہی پیغام آکر بادشاہ سلامت کو دیا تو بادشاہ سلامت چلاّئے: ''یہ تو بہت مہنگی ہیں۔ یہ شخص مجھے کوئی دھوکے باز لگتا ہے اسے کہو کہ میں یہ اسٹرابیریز صرف ایک سونے کے سکے کے عوض خرید سکتا ہوں اور اسے بتاؤ کہ یہ ایک سونے کا سکہ بھی وہ غنیمت سمجھے۔'' پیادہ دوبارہ بانسری نواز کے پاس گیا اور اسے بادشاہ سلامت کا پیغام پہنچایا تو اس نے جواب میں معذرت کرلی اور کہا کہ اسٹرابیریز اس کی اپنی ہیں، اس لیے وہ ان کی جتنی بھی قیمت منتخب کرے، یہ اس کا حق ہے اور وہ تین سونے کے سکوں سے کم انہیں نہیں بیچے گا۔ اب جب یہ پیغام دوبارہ بادشاہ تک پہنچا، وہ سخت ناراض ہوا کیوں کہ اس کی نیت صرف اسٹرابیریز کا حصول تھا۔ ان کے بدلے میں وہ ان کی کوئی قیمت بھی ادا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے چالاکی سے بانسری نواز کو محل میں بلوا بھیجا اور کہا کہ وہ اسے اسٹرابیریز کی قیمت محل میں دے گا، لہٰذا بانسری نواز اسٹرابیریز سمیت محل میں آ گیا۔ پیادے ایک سونے کی بڑی سی رکابی لے آئے اور انتہائی خوب صورتی سے اسٹرابیریز اس میں سجا دی گئیں اور اسے لاکر بادشاہ کے سامنے رکھ دیا گیا جس نے فوراً انہیں نگلنا شروع کردیا۔ بچو! آپ یقین نہیں کریں گے کہ وہ ایک ہی ہلّے میں ساری اسٹرابیریز ہضم کرگیا، رکابی میں ایک بھی نہیں چھوڑی۔ جب وہ فارغ ہوا تو اس نے چاندی کا ایک سکہ بانسری نواز کی طرف اُچھال دیا اور کہا کہ یہ اسٹرابیریز تین تو کیا ایک سونے کے سکے کی بھی نہیں تھیں۔ اب یہ چاندی کا سکہ اُٹھاؤ اور یہاں سے چلتے بنو لیکن بانسری نواز نے سختی سے بادشاہ کو کہا کہ وہ اس کے تین سونے کے سکے دے گا تو وہ جائے گا۔ بادشاہ کے تو تن بدن میں گویا آگ لگ گئی۔ اس نے سپاہیوں کو کہا کہ اس شخص کو زندان میں ڈال دو لیکن اس سے پہلے کہ سپاہی بانسری نواز کو ہاتھ لگاتے بانسری نواز نے بانسری اپنے ہونٹوں سے لگائی اور ایک عجیب سی دھن کی آواز فضا میں بکھر گئی۔ پھر وہ کھلکھلا کر ہنسا، بادشاہ کو جھک کر سلام کیا اور پھر محل سے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس سے پہلے کہ بادشاہ حکم دیتا کہ سپاہی اس بانسری نواز کے پیچھے جائیں، اس کے سر میں عجیب سی توڑ پھوڑ محسوس ہونے لگی۔ اس کی حالت بڑی مضحکہ خیز ہوگئی۔ اسے لگا جیسے اس کا سر بڑا ہوتا جارہا ہے لیکن ایسی چیزیں ہوتی ہوئیں نہ کسی نے سنی تھیں اور نہ دیکھی تھیں۔ وہ حیران بھی تھا اور خوف زدہ بھی۔ پھر اس نے ایک نظر اپنے مصاحبوں کی طرف دوڑائی تو وہ بھی اسے گھور رہے تھے اور

ایک ایک کر کے انہوں نے منہ پر ہاتھ رکھنے شروع کر دیئے تاکہ کسی طرح اپنی ہنسی روک سکیں۔ بادشاہ فوراً اُٹھا اور سیدھا آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ پھر جو اس نے آئینے میں دیکھا، وہ اس کے رونگٹے کھڑے کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس کے سر کے سائز میں اضافہ ہو چکا تھا اور اس کی بناوٹ بالکل ایسے ہو گئی تھی جیسے بڑی سی اسٹرابری اس کے کندھوں پر رکھی ہو۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ویسی کی ویسی تھیں۔ بڑا سا ناک بھی تھا اور سارا دن جھوٹ بولنے والا منہ بھی موجود تھا لیکن ایسے لگتا تھا جیسے یہ ساری چیزیں اس کے اسٹرابری نما سر میں گم ہو گئی ہوں جو اب اس کے کندھوں پر پکی ہوئی اسٹرابری کی طرح رکھی ہوئی ہوں اور اسے دیکھ کر دل کرتا تھا کہ اسے ابھی توڑ لیا جائے۔

''یہ جادو ہے، یہ اسٹرابیریز جادو کی تھیں۔ فوراً اس بانسری نواز کو پکڑو۔'' وہ چلایا۔ پیادے ہنستے ہوئے بانسری نواز کی تلاش میں بھاگے۔ انہوں نے جلد ہی اسے تلاش کر لیا اور اسے پکڑ کر واپس لے آئے لیکن اب وہ اس کے ساتھ سختی سے پیش نہیں آ رہے تھے کہ بادشاہ کی طرح کہیں وہ ان پر بھی کوئی جادو نہ آزمائے۔ جب بادشاہ نے بانسری نواز کو دیکھا تو وہ اس پر دھاڑا اور پوچھنے لگا: ''تمہاری اس حرکت کا کیا مطلب تھا؟ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہیں ساری عمر قید میں ڈال دیا جائے؟'' ''ہرگز نہیں۔'' بانسری نواز نے کہا۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر بادشاہ کو دیکھ کر اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔ پھر کہنے لگا: ''لوگ بھی تمہیں دیکھ کر یونہی ہنسیں گے۔''

''مجھے دیکھیں گے؟ میں انہیں اپنے آپ کو نہیں دیکھنے دوں گا۔'' بادشاہ نے چلّا کر کہا۔

''اپنا جادو واپس لے لو اور میرا سر عام انسانوں کی طرح چھوٹا کرو۔'' وہ غرّایا، لیکن بانسری نواز نے کہا: ''یہ تمہاری سزا ہے، میں تمہیں ٹھیک نہیں کروں گا۔'' بادشاہ یہ سن کر غصے میں ہکلانے لگا۔ وہ اتنا ناراض تھا کہ اس نے سپاہیوں کو کہا کہ اس بانسری نواز کا سر قلم کر دو۔ بانسری نواز نے یہ حکم سنا تو اس نے بادشاہ کو یاد دلایا کہ ''میرا سر قلم کرنے سے تمہارا سر ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ میں ہی وہ شخص ہوں جو اس جادو کو ختم کر سکتا ہے۔ اگر تم نے مجھے قتل کروا دیا تو پھر تم بھی ساری عمر اپنا اسٹرابری نما سر لے کر دُنیا میں گھومو گے۔'' بادشاہ یہ سن کر خاموش ہو گیا۔ یہ بات بالکل صحیح تھی، یہ بانسری نواز ہی تھا جو اسے اس مشکل سے نکال سکتا تھا اور واقعی اسے قتل نہیں کروانا چاہیے تھا۔ اس نے تمام مصاحبوں سے تخلیہ مانگ لیا۔ اب وہ اور بانسری نواز اکیلے رہ گئے۔ بادشاہ نے بانسری نواز کو پیش کش کی کہ وہ اسے چار سونے کے سکے دے سکتا ہے لیکن اس کے بدلے بانسری نواز کو اسے ٹھیک کرنا ہو گا۔ بانسری نواز ہنسا اور کہنے لگا کہ وہ اس سے کہیں زیادہ چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ بادشاہ اسے اپنا آدھا خزانہ دے دے۔ بادشاہ کی تو سٹی گم ہو گئی۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ شخص پاگل ہے۔ یہ مجھے تباہ کر دے گا۔ بانسری نواز اس کے خیالات جانتا تھا۔ اس نے بادشاہ کو کہا کہ تم دُنیا کے سب سے امیر آدمی ہو اور تمہاری رعایا دُنیا کی غریب ترین رعایا۔ تم اپنی دولت بڑھانے کے لیے ان کے منہ کا نوالہ بھی چھین لیتے ہو، صرف اس لیے کہ تمہیں قیمتی پوشاک

پہننی ہے اور کھاتے رہنا ہے۔ تمہارے لوگ بھوک سے مر رہے ہیں اور جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ ان کے چہروں پر خوشی کی کوئی رمق باقی نہیں ہے۔ تمہیں ایک بادشاہ کی حیثیت سے شرمسار ہونا چاہیے۔ بادشاہ کا چہرہ پہلے ہی اسٹرابری کی طرح ہونے کی وجہ سے سرخ تھا، اب چقندر کی طرح سیاہ ہوگیا۔ اس نے کہا کہ یہ سچ نہیں ہے لیکن بانسری نواز نے کہا کہ تم باہر نکل کر دیکھو۔ اے بگڑے ہوئے فریبہ لالچی انسان لوگ تم پر ہنسیں گے۔ بادشاہ کی حالت قابلِ رحم تھی۔ وہ کسی قیمت پر اتنی رقم بانسری نواز کو نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ پھر بانسری نواز نے حکمیہ بادشاہ کو کہا کہ اپنا کوٹ پہنے اور سر پر اسکارف اوڑھ لے، وہ اسے باہر لے جا کر حقیقت دکھانا چاہتا ہے۔ بادشاہ نے انکار کیا لیکن پھر مجبوراً اسے جانا ہی پڑا۔ بانسری نواز اسے شہر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ گھماتا رہا، اس نے اسے غریب اور لاغر بچے دکھائے۔ پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے لوگ دکھائے۔ پچکے ہوئے گال اور اُداس آنکھیں دکھائیں، پھر اس نے لوگوں کا بادشاہ کو بُرا بھلا کہتے اور بددعائیں دیتے ہوئے سنا۔ کسی کو پتا نہیں تھا کہ یہ بڑے سر والا دراصل ان کا بادشاہ ہے۔ بادشاہ کے کان یہ باتیں سن سن کر جلنے لگے۔ وہ کسی جگہ چھپنا چاہتا تھا۔ وہ حیران تھا کہ لوگ اس سے اتنی نفرت کرتے ہیں۔ اس نے بانسری نواز سے کہا کہ اسے ان باتوں کا علم نہیں تھا۔ بانسری نواز نے اسے جتایا کہ وہ تو اتنی خودغرضی کے جال میں اُلجھا ہوا ہے۔ پھر بادشاہ اور بانسری نواز محل میں آئے تو بانسری نواز نے دوبارہ رقم کا تقاضا کیا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ وہ اس رقم کا کیا کرے گا؟ بانسری نواز نے اسے بتایا کہ وہ غریب لوگوں میں تقسیم کرے گا کیوں کہ اس رقم پر اصل حق انہی کا ہے۔

بادشاہ بڑی دیر بیٹھ کر سوچتا رہا آخر اس نے چپ کا روزہ توڑا اور کہنے لگا کہ تم یہ نیک کام خود نہیں کرو گے بلکہ میں کروں گا۔ اگر میں نے لوگوں سے کچھ چھینا ہے تو میں ہی انہیں لوٹاؤں گا بھی اور آئندہ سے لوگوں کا اپنے بچوں کی طرح خیال کروں گا۔ ہوسکتا ہے اس طرح مجھے ان کی آنکھوں میں اپنے لیے عزت اور محبت نظر آئے۔ پھر جیسے ہی وہ خاموش ہوا اس نے دوبارہ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کے سر میں دوبارہ کچھ ہونے لگا تھا۔ وہ اور ڈر گیا کہ مبادہ اس کا سر مزید بڑا نہ ہو رہا ہو۔ وہ ایک دفعہ پھر بھاگ کر آئینے کے سامنے گیا اور حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا،

نیا سال

ظفر محمود انجم، قصور

نیا سال آیا نئے روپ سے
کہ نیا سورج ہے نئی دھوپ سے
چمن مسکرایا نئے گل کھلے ہیں
بہاروں کے اب قافلے چلے ہیں
زمانے کا بدلہ کچھ انداز ہے
چمک اک نئی اور آواز ہے
پرندوں کی اُڑتی ہوئی ٹولیاں
اور گاتی ہوئی میٹھی سی بولیاں
یہ گرتے ہوئے آبشاروں کے پانی
یہ بچپن بڑھاپا یہ نادان جوانی
خدا کا بنایا ہوا کھیل ہے
یہیں ہے بچھڑنا یہیں میل ہے

اس نے دیکھا کہ اس کا سر اپنی اصلی شکل اختیار کر چکا تھا اور جادو کا اثر زائل ہو چکا تھا۔

بانسری نواز مسکرا رہا تھا۔ بادشاہ حیران رہ گیا جب بانسری نواز نے بانسری منہ سے لگا کر انتہائی خوش کن دھن چھیڑی اور تھرکتا ہوا تیزی سے بادشاہ کے کمرے سے باہر نکل گیا۔ بادشاہ اس کے جانے کے بعد کافی دیر سوچتا رہا۔ اس نے مصاحبوں کو بلایا اور اپنی آدھی دولت غریبوں میں تقسیم کرنے کا اعلان کیا اور ہمیشہ لوگوں سے اچھا سلوک کرنے کا وعدہ تمام عمر پورا کرتا رہا لیکن جب بھی اس نے اپنے مصاحبوں سے اپنے اسٹرابری جیسے سر کے متعلق پوچھا تو انہیں گویا ہر شے بھول چکی تھی۔ آہستہ آہستہ بادشاہ کو بھی ایسا لگنے لگا جیسے اس نے خواب دیکھا تھا۔ اس نے بانسری نواز کو ڈھونڈ کر لانے والے کے لیے بھی انعام کا اعلان کیا لیکن وہ بانسری نواز کبھی کسی کو نہ مل سکا۔

اس کے علاوہ بادشاہ سلامت ایک اور بات پر ساری عمر کاربند رہے وہ یہ کہ دوبارہ ساری عمر انہوں نے اسٹرابیریز نہیں چکھیں لیکن بچو! آپ تو جانتے ہیں کہ بادشاہ سلامت تمام عمر اسٹرابیریز سے پرہیز کیوں کرتے رہے؟

☆☆☆

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 / جنوری 2015ء ہے۔
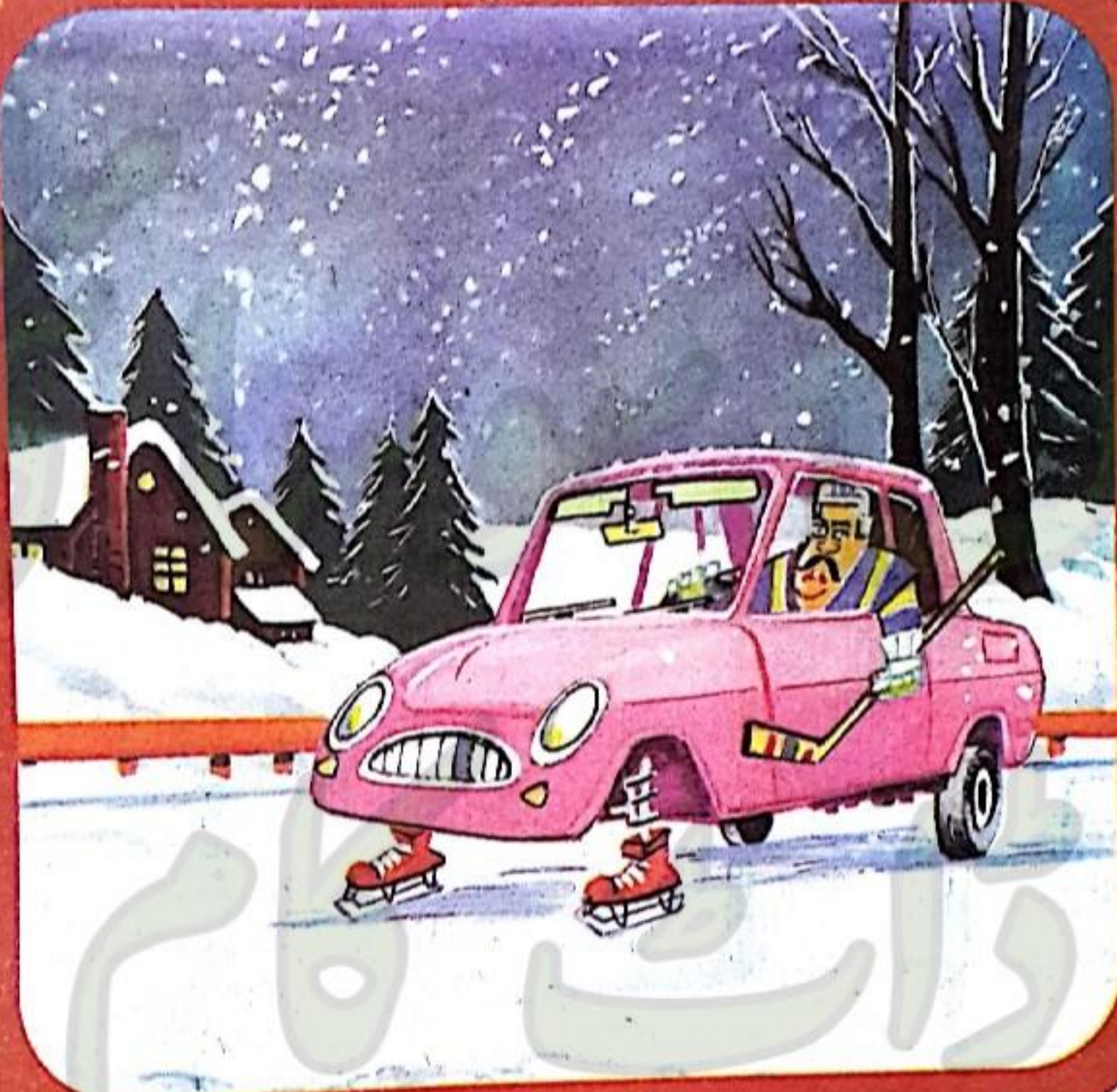
دسمبر 2014ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- بیمار جانور بیچ کر یہ قصاب بناتے ہیں عوام کو بے وقوف (فاطمہ اختر، راول پنڈی)
- گائے ہوئی بے حال، قصائی ہوا خوش حال (شمائم سہیل، راول پنڈی)
- ایک سے بڑھ کر ایک .... (وقاص اشفاق، پاک پتن)
- گائے ہوئی قربان، بیماری سے میں پریشان، میری بھی لے لو جان (نافیہ فہیم، لاہور)
- ذرا پیچھے مڑ کر دیکھو بھائی، اب تو تمہاری شامت آئی (خنسہ امتیاز، راول پنڈی)

ہونہار مصور

مزارِ قائد

تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔

فائزہ رضا، گجرات (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)
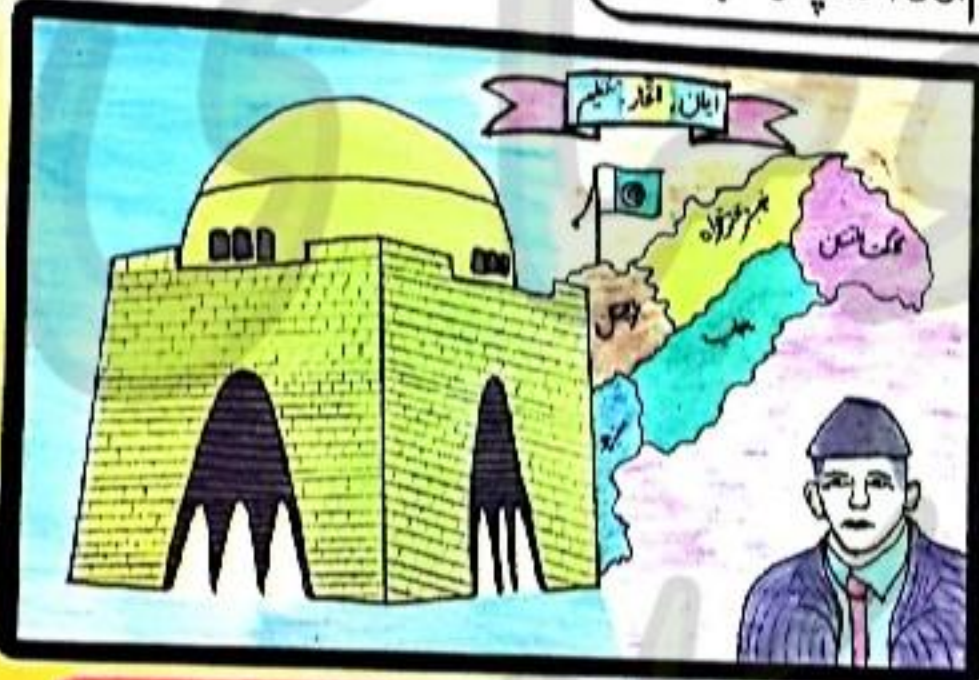
لائبہ عرفان، کراچی (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

محمد علیان جمشید، لاہور (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

سرفراز ناظر، کوہاٹ (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

عاتکہ قاسم، لاہور (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: حافظہ تنزیلہ افضل، بہاول پور۔ جویریہ رمضان، ملتان۔ سید نعمان حسین، لاہور۔ لائبہ عرفان، کراچی۔ فوزیہ فردوس، کرک۔ کشف عروج، تلہ گنگ۔ مریم اعجاز، لاہور۔ صفا رشید، کراچی۔ عروبہ خان، شرقپور۔ سید محبوب علی شاہ، پشاور۔ حزل، نوشہرہ۔ ملیحہ وسیم، گوجرانوالہ۔ محمد حنظلہ سعید، محمد حمزہ، محمد وجیہہ الحسن، سدرہ افتخار، فیصل آباد۔ محمد شکیب مسرت، بہاول پور۔ محمد بلال انصاری، اسلام آباد۔ محمد سعد ذیشان، لاہور۔ محمد حسن ندیم، اٹک۔ سمعیہ توقیر، کراچی۔ انوشہ منظور، کراچی۔ محمد عرفان آفریدی، پشاور۔ عائشہ مجید، لاہور۔ خاور اقبال، تری خیل۔ تحریم اعظم خان، سرگودھا۔ نازیہ ندیم، راول پنڈی۔ عاتکہ سہیل، لاہور۔ محمد سجاد، اوکاڑہ۔ محمد شاہ زیب مسرت، بہاول پور۔ محمد ضرار نوید، راول پنڈی۔ نفیسہ ناز، منیبہ ناز، ہری پور ہزارہ۔ عائشہ مشتاق، منڈی بہاؤالدین۔ محمد عبداللہ لطیف، مریدکے۔ ماریہ اعجاز، کوٹ مومن۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

جنوری کا موضوع
نیا سال
آخری تاریخ 8 جنوری

فروری کا موضوع
لائبریری
آخری تاریخ 8 فروری